CARE LIST APPROVED PEER REVIEWED & REFEREED JOURNAL

ISSN 2320-3781

نقشِ نو

۲۰۲۵ء۔۲۰۲۶ء

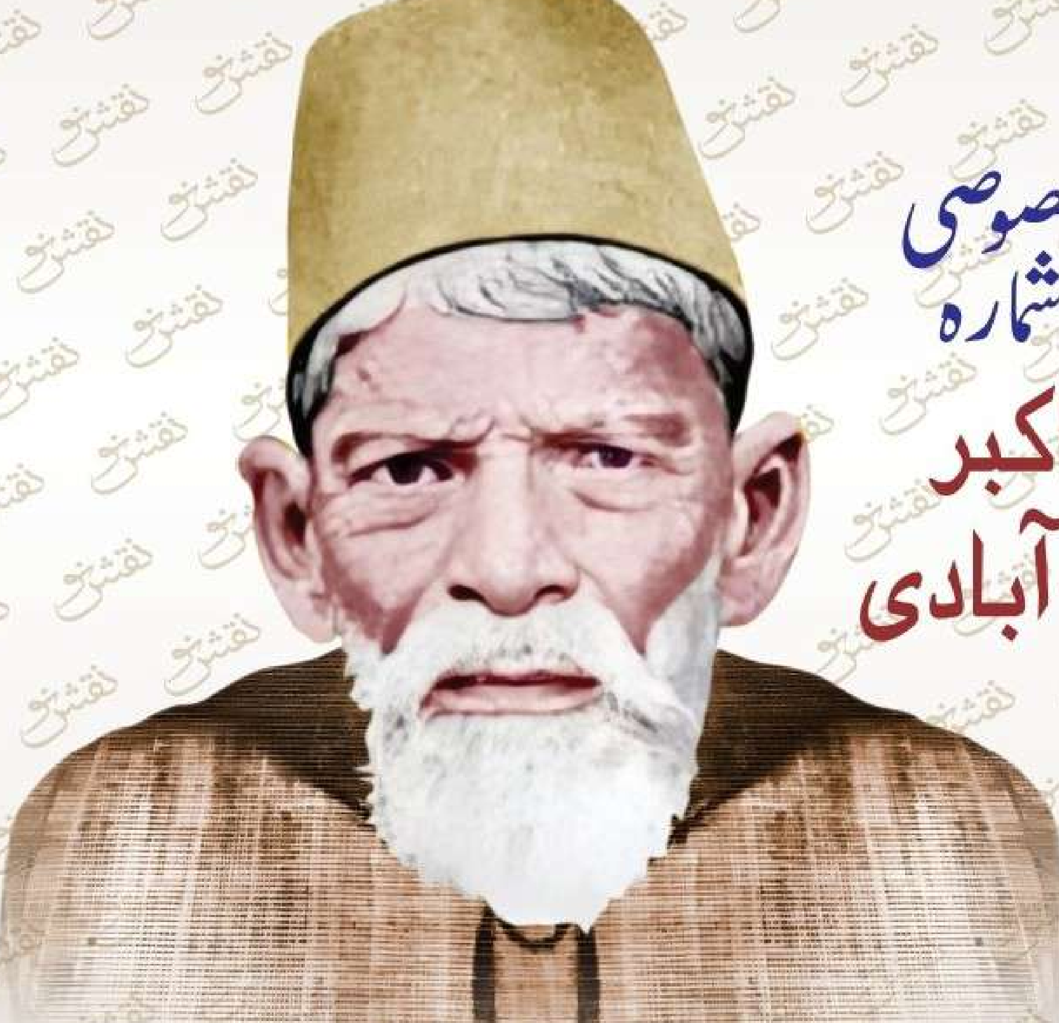

خصوصی شمارہ

اکبر الہ آبادی

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگراج

الہ آباد یونیورسٹی

نقشِ نو

(اکبر الہ آبادی نمبر)

سالانہ عالمی اردو جریدہ

۱۸ واں شمارہ

۲۰۲۵ء۔۲۰۲۶ء

مدیر: پروفیسر ناصحہ عثمانی   نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

الہ آباد یونیورسٹی

'نقشِ نو' سالانہ عالمی اردو جریدہ۔ ۱۸ واں شمارہ

یو۔ جی۔ سی۔ CARE لسٹ میں منظور شدہ جریدہ

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ　　اعزازی مدیر: پروفیسر عبدالحق

مدیر: ڈاکٹر ناصحہ عثمانی　　نائب مدیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم

معاون مدیر: ڈاکٹر فرح ہاشم

مجلسِ مشاورت:

ڈاکٹر مامون ایمن (نیویارک)　　پروفیسر شبنم حمید (پریاگ راج)

ڈاکٹر محمد آصف علی (ماریشس)　　ڈاکٹر ندرت محمود (پریاگ راج)

پروفیسر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)　　ڈاکٹر شبانہ عزیز (پریاگ راج)

پروفیسر احمد محفوظ (دہلی)　　ڈاکٹر صدیقہ جابر (پریاگ راج)

پروفیسر یوسفہ نفیس (پریاگ راج)

کمپیوٹر کمپوزنگ: روزینہ انصاری

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، پریاگ راج۔ یو۔ پی۔ انڈیا

فون نمبر: 0532-2978600　موبائل نمبر: 7007400501 -9559258741

ای میل: naqshenauurdu@gmail.com

ISSN 2320-3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 200 روپئے، بیرون ملک 20 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبرشمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	سخنہائے گفتنی	پروفیسر ناصحہ عثمانی	۴
۲۔	اکبر کی شاعری اور ترقی پسند تنقید	پروفیسر علی احمد فاطمی	۵
۳۔	اکبرالہ آبادی کی نظمیہ شاعری	پروفیسر ابوبکر عباد	۱۴
۴۔	اکبرالہ آبادی کی شاعری میں کلاسیکی رنگ	پروفیسر ناصرہ سلطانہ	۲۱
۵۔	اکبرالہ آبادی کا تخلیقی انفراد	پروفیسر بشریٰ بانو	۲۸
۶۔	اردو شاعری کی دنیا میں اکبرالہ آبادی کی انفرادیت اور ان کا مقام و مرتبہ	ڈاکٹر الیاس عزیز ندوی	۳۵
۷۔	طنز و مزاح کا شہنشاہ اکبرالہ آبادی	ڈاکٹر لئیق رضوی	۴۲
۸۔	اکبرالہ آبادی تصوف کے تناظر میں	ڈاکٹر طالب اکرام	۴۷
۹۔	اکبرالہ آبادی کی شاعری میں اصلاحی عناصر	ڈاکٹر شیخ عمران	۵۷
۱۰۔	اکبرالہ آبادی کی شاعری کی فنی و ادبی خصوصیات	ڈاکٹر شاہدہ نواز	۶۲
۱۱۔	فخر الہٰ باد اکبرالہٰ بادی	ڈاکٹر شہناز صبیح	۶۸
۱۲۔	طنزیہ شاعری کا نقیب اکبرالہ آبادی	ڈاکٹر عبدالحفیظ	۷۲
۱۳۔	اکبرالہٰ آبادی کی فارسی شاعری	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۷۷
۱۴۔	گاندھی نامہ: اکبر کے بہانے گاندھی کے تقاضے	ڈاکٹر طاہرہ پروین	۸۵
۱۵۔	اکبر اقبال اور الہ آباد	نفیس عبدالحکیم	۸۸
۱۶۔	اکبرالہ آبادی کی شاعری: مشرقی تہذیب اور طنز و مزاح کا حسین امتزاج	عبدالحافظ فاروقی	۹۴
۱۷۔	اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں مشرقیت اور قومیت	ڈاکٹر جاں نثار عالم	۱۰۰
۱۸۔	اکبرالہ آبادی بحیثیت قومی شاعر	ڈاکٹر اقصیٰ امان	۱۰۵
۱۹۔	اکبرالہ آبادی کی مکتوب نگاری	زینت خاتون	۱۰۹
۲۰۔	اکبرالہ آبادی کے خطوط: شگفتہ مزاح میں سنجیدہ پیغام	نازیہ افضل	۱۱۶
۲۱۔	اکبرالہ آبادی: کثیر الجہات شخصیت	شاذیہ غلام انصاری	۱۲۱
۲۲۔	اکبرالہ آبادی کا تصور تعلیم نسواں اور معاشرتی اصلاح	گل شمع بانو	۱۲۴
۲۳۔	اکبرالہ آبادی کا فکر و فن	شبیب نجمی	۱۲۷
۲۴۔	اکبرالہ آبادی کی خطوط نگاری	الماس احمد انصاری	۱۳۴

سخنہائے گفتنی

آج کی نئی نسل اردو زبان وادب سے صرف نا آشنا نہیں ہے بے زار بھی نظر آ رہی ہے ان کے مطابق آج کے برقی نظام اور مصنوعی ذہانت کے دور میں شعر وادب کی کوئی گنجائش نہیں یہ بحث اس وقت بھی شروع ہوئی تھی جب کمپیوٹر کا دور شروع ہوا تھا۔ اسی الہ آباد کی سرزمین پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں تمام معززاور معتبر اردو دانوں نے اپنے۔ اپنے خیالات میں کتابوں کی اہمیت کم ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا اور اس تشویشناک صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے دنیائے اردو کو تیار کرنے کے لئے سب کو آمادہ کیا جب کہ سنجیدہ قاری کبھی ترک کتابیات نہیں کرتا بلکہ نئے مواقع کا فائدہ اٹھا کر مزید ترقی کی طرف گامزن ہوتا ہے جس نے خود قد آور ناقد پروفیسر شمس الرحمان فاروقی کو کمپیوٹر پر کام کر کے اور میل (Email) اور سوشل میڈیا کے ذریعہ ۲۱ ویں صدی کے ابتدا میں ہی ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے پایا ہے وہ اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا اور آج ریختہ اور دیگر ویب سائٹس اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو نے بھی نئی ایجادات سے نئے تجربات حاصل کیے ہیں۔ آج ایک بار پھر سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت (AI) سے جہاں سب بہت کچھ حاصل کر رہے ہیں اردو والے ایک بار پھر خوف کا شکار ہیں یہ ضرور ہے کہ ہر چند جدید ایجاد کا ہر دور میں غلط استعمال ہوا آج بھی ہو رہا ہے۔ سوشل میڈیا پر گھٹیا ادب میرؔ، اقبالؔ، اکبرؔ کے نام پر کچھ بھی غیر معیاری چیزیں ڈال دینا عام سی بات ہوگئی ہے لیکن اس سے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ کی برتری اور افضلیت پر کچھ بھی حرف نہیں آ سکتا۔ ایک اردو داں (اگر وہ ایک اچھا قاری بھی ہے) ایک ہی نظر میں ان غیر معیاری اشعار کو مسترد کر دیتا ہے۔ ریختہ نے نا معلوم کتنی نایاب کتابیں جو شاید بہت دقتوں سے پڑھنے کو ملتیں اور کچھ تو مل بھی نہیں سکتیں، ان کو ایک کلک پر ڈاؤن لوڈ کی سہولیت دے دی۔ اگر اشعار نہیں ہونگے تو تقریر کی لذت بھی نہیں رہے گی گرمیوں کے آتے ہی غالبؔ کے شوق آم اور سردیوں میں اکبرؔ کے ذوق امرود کی بات الہ آباد کی تہذیت کا ایک خاص حصہ بن چکا۔

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے یاں دھرا کیا ہے بجز اکبرؔ کے اور امرود کے

اکبرالہ آبادی ہمارے شہر کی مایۂ ناز اور قابل فخر تہذیب کا سنہرا باب ہیں وہ ایسے شاعر ہیں جن کا کلام بڑے، بچے، مذہبی، ادبی سبھی لوگوں میں آج بھی مقبول ہے چنانچہ اکبرالہ آبادی کی شہرت اور مقبولیت نیز تہذب الہ آباد کی ادبی روایت کو تربیت دینے کی خاطر 'نقش نو' کی مجلس ادارت نے اس بار کے شمارے کو اکبر کے نام معنون کرنے کا تہیہ کیا۔ نتیجہ آپ کے ہاتھ میں یہاں ایک اعتراف ضروری ہے کہ تحقیقی مقالے کی اہمیت کے مدنظر کچھ موضوعات کی تکرار ہے جسے روا رکھا گیا۔ نیز ریسرچ اسکالر کو بھی ان کی حوصلہ افزائی اور تحقیق کی نئی نسل کو فروغ دینے کے لئے شامل کیا گیا ہے۔ دوران قرات آپ کئی ریسرچ اسکالرز کے مضامین بہت محققانہ پائیں گے۔ وہ یقیناً ایک خوش آئند مستقبل کے امین ہیں۔

نقش نو کا یہ خصوصی شمارہ اگر اکبرالہ آبادی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کچھ نئے گوشے اجاگر کرنے میں کامیاب ہوا تو ہمارے لئے باعث صد اطمینان اور مسرت ہوگا کیونکہ اکبرؔ کا کلام آج بھی صاحب بصیرت کے لئے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ

کیا کام چلے کیا رنگ جمے کیا بات بنے کون اس کی سنے ہے اکبر بے کس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف

فریاد کیے جا اے اکبر کچھ ہو ہی رہے گا آخر کار اللہ سے توبہ ایک طرف صاحب کی دہائی ایک طرف

مجلس ادارت اپنے سبھی قلمکاروں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے جنکے قلمی تعاون سے یہ شمارہ وقت پر منظر عام پر آ سکا۔ ہم اپنے استاد اور اعزازی مدیر محترم جناب پروفیسر عبدالحق صاحب کے ممنون کرم ہیں کہ ان کے مشفقانہ مشورے اور حوصلہ افزا الفاظ ہمیں اپنی ناقص ادبی خدمات انجام دینے کا عزم دیتے ہیں۔

شکریہ

پروفیسر ناصحہ عثمانی

مدیر

اکبر کی شاعری اور ترقی پسند تنقید

جس طرح ترقی پسند نقادوں نے سرسید کی عقل پرستی اور روشن خیالی کو تو پسند کیا لیکن ان کی اعلیٰ طبقہ سے دوستی اور جاگیردارانہ سماج سے قربت کو ناپسند کرتے ہوئے ان سے اختلاف بھی کیا یہی وجہ ہے کہ ان پر کم سے کم لکھا۔ کم و بیش یہی رویہ اکبر کے ساتھ بھی رہا تاہم ترقی پسند نقادوں نے جو کچھ لکھا اس میں اکبر کو ایک اہم شاعر تو تسلیم کیا لیکن ان کی مشرق زدگی ۔ ماضی پسندی اور کہیں کہیں دقیانوسیت پر کہیں گرم اور کہیں نرم قسم کے سوالات بھی قائم کئے ۔ انھیں ترقی و تبدیلی کا مخالف قرار دیا۔ پیش نظر مضمون میں اکبر پر لکھے گئے چند ممتاز ترقی پسند نقادوں کے مضامین کا سرسری جائزہ پیش خدمت ہے تاکہ ان کی پسند ناپسند کا ایک معروضی خاکہ پیش ہو سکے۔

اس ضمن میں ترقی پسند تنقید کے سب سے اہم نام احتشام حسین سے گفتگو کا آغاز کروں گا۔ ان کا بے حد اہم مضمون 'اکبر کا ذہن' کے عنوان سے ملتا ہے جو ان کی کتاب تنقید اور علمی تنقید میں شامل ہے۔ مضمون کی ابتدا میں کہتے ہیں:

''اکبر کی شاعری ادب اور مقصد کے تعلق کی ایک نمایاں اور دلنشین مثال ہے اکبر اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں منفرد ہیں اس لئے ان کے فن شعور کی کسوٹی ان شعراء سے مختلف ہو گی جو کسی روایت سے پابند ہو کر مخصوص حدوں کے اندر ہی اپنے خیالوں کی جولاں گاہ بناتے ہیں۔ وہ بھی روایتوں کے پابند تھے لیکن فن اور تکنیک میں انھوں نے اپنی روایتیں خود بنائیں۔''

خیال رہے کہ احتشام حسین نے ان ابتدائی تحریروں میں انھیں منفرد ضرور کہا لیکن کسوٹی فنی شعور کو ہی رکھا۔ روایت کا پابند کہا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ انھوں نے اپنی روایتیں خود بنائیں۔

احتشام حسین نے ابھی تک اکبر کی فکر کی کوئی بات نہیں اٹھائی حالانکہ احتشام صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ اکبر خود اپنے آپ کو معنی کا پرستار بتاتے ہیں اور یہ بھی کہ انھیں صورت سے کوئی سروکار نہیں۔ احتشام صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ اکبر نے معنی کو صورت سے ہم آہنگ تو کیا نامانوس الفاظ کو استعمال کر کے نئی علامتیں دیں معنی تو دیئے لیکن ان بتوں کی پرستش سے آزاد نہ ہو سکے جو قدماء ان کے لئے ورثہ میں چھوڑ گئے تھے۔ یہ آسان ہوتا بھی نہیں ہے۔ اکبر نے اپنے والد سے جس نوع کی صوفیانہ تعلیم حاصل کی ۔ وحید کی شاگردی اختیار کی اور غزل وہ بھی روایتی غزل گوئی کی جو مشاقی حاصل کی تھی اور جو اس عہد کا طرہ امتیاز تھی وہ صورتوں میں ان کا قیود سے باہر نکلنا ناممکن سا تھا لیکن ۱۸۷۷ء کے بعد وہ اچانک غزل سے طنز و مزاح کے میدان سے آ گئے اور کہہ اٹھے

سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

اگرچہ انھوں نے یہ بھی کہا

غلطیاں مد ظرافت میں اگر آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں مجھ کو معاف

لیکن اکبر آسانی سے معاف نہیں کئے گئے ترقی پسند نقادوں میں بطور خاص، خود اکبر نے بھی آسانی سے کسی کو معاف نہیں کیا سرسید جس کی اعلیٰ مثال ہیں۔ لیکن نقادوں نے فکری سطح پر اختلاف کے باوجود اکبر کی شاعری کے خصائص تلاش کئے اور انھیں شعر و ادب میں منفرد قرار دیتے ہوئے اعلیٰ مقام سے سرفراز کیا۔ احتشام حسین بھی اکبر کو منفرد مانتے ہیں لیکن فکری طور پر اختلاف بھی کرتے ہیں جو تنقید کی سب سے بڑی جمہوریت ہوا کرتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اکبر کی طرح شاعری میں حرف و لفظ، زبان و بیان کا خواہ کتنا ہی بڑا کمال اور اکبر کے تعلق سے چونچال ہو شاعری فکر و فلسفہ کے بغیر بڑی نہیں ہوتی۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ تنقید محض اشعار کے فنی محاسن اور معائب کے شمار کر لینے کا نام نہیں، ضروری ہے کہ ہر خیال کی مادی بنیاد کا پتہ لگایا جائے اس طرح اس کے فنی شعور کا تجزیہ بھی ہو سکے گا اور اس کے محرکات شعری کا علم بھی۔ حالانکہ محرکات، نظریات اور شعری تلازمات کی وحدت قرار پانا اور تخلیقی جودت میں تبدیل کر پانا

پروفیسر علی احمد فاطمی، سابق صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی

آسان کام نہیں اور نہ اس کی تلاش آسان ہے تاہم بڑی تنقید یا بڑا نقاد ان جڑوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جہاں اس کے سوتے پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔ یہ کام بھی آسان نہیں اس کے لئے بقول فراق شعورِ علم سے زیادہ شعور کائنات کی ضرورت ہوا کرتی ہے شعورِ کائنات کا فقدان ہی اکثر تنقید کو حرف ولفظ یا زبان و بیان تک محدود کر دیتا ہے ایسی صورت میں ایک جیسے رنگا رنگ اور مختلف مزاج و کردار کے شاعر کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا اور اکبر کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ شاید حالی اور شبلی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نقاد اگر اپنی ذاتی پسند ناپسند یا فکر ونظر سے شاعری کو جانچے پرکھے گا تو صحیح فیصلہ نہ کر سکے گا شاعری کو اسی مقام و ماحول سے دیکھنا سمجھنا ہوگا جس ماحول و محرکات سے اس کا جنم ہو رہا ہے۔ احتشام حسین کے یہ خوبصورت جملے ملاحظہ کیجئے:

''جو چیز شاعری کو ساحری اور بے جان لفظوں کو چلتی ہوئی تلوار بناتی ہے اسے الفاظ میں نہیں، شاعر کے دل میں تلاش کرنا چاہئے۔''

خود اکبر نے کہا ہے۔

وہاں الفاظ خضر رہ ہیں یاں معنی ہیں منزل پر
زباں کا ان کو دعوی ہے تو مجھ کو ناز ہے دل پر

احتشام حسین کے یہ جملے بھی ملاحظہ کیجئے:

''اکبر نے الفاظ کو خضر راہ بنا کر بہت سی منزلیں طے کیں لیکن جس شاعری کی بنا پر ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے وہ محض لفظی کرتب نہیں بلکہ ان کا خونِ جگر ہے جو بہ قول اقبال سل کو دل بناتا ہے۔''

احتشام حسین کا پورا مضمون اسی دل اور منزل کی تلاش میں رقم ہوتا ہے۔ احتشام حسین چونکہ ترقی پسند مارکسی نقاد تھے۔ ان کی تنقید تاریخ وتہذیب کے سہارے آگے بڑھتی ہے چنانچہ اس مضمون میں بھی ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات نشاۃ الثانیہ کا دور۔ تہذیب کی کشمکش اور نظریات کے تصادم کا ذکر ملتا ہے۔ وہ اکبر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اکبر کے ارتقائے شعور کا دور غیر معمولی کشمکش کا دور ہے اور اکبر نے اس کشمکش کو چھپایا نہیں ہے بلکہ اس کے ہر پہلو کو پیش کیا ہے۔ اکبر کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو مشکل ہی سے عصری تاریخ کا کوئی ایسا واقعہ ہوگا جس کی طرف اشارے نہ مل جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے متعلق اکبر کا ردعمل بھی معلوم ہوگا۔''

احتشام حسین جہاں اکبر کے عمل کے اس پھیلاؤ کی تعریف کرتے ہیں وہیں ان کے ردعمل کی تنقید کرتے ہیں لیکن یہ صرف تنقید ہے جو ہر دیانت دار نقاد کرتا ہے۔ تنقیص نہیں۔ خود احتشام حسین کی تنقید میں بھی پھیلاؤ آجاتا ہے اور وہ اکبر کو وسیع تاریخی وتہذیبی سیاق وسباق میں پرکھتے ہیں۔ حالات، ادوار، غزل کی ماہیت اور نظم کی طرف مراجعت وغیرہ بے حد معنی خیز انداز میں ابھرتے ہیں اور اکبر کی جذباتی معصومیت کے بارے میں بھی بڑے سلیقے سے اپنی بات کہتے ہیں کہ اس عہد میں ایک ترقی یافتہ سماجی اور سائنسی شعور سامنے نہ آسکا تھا جو بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی تک آیا اور پھیلا جس سے پوری ترقی پسند تحریک مستفیض ہوئی اور یہی فرق ہے علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک میں کہ وہ انیسویں صدی کی تحریک تھی اور یہ بیسویں صدی کی تحریک جس نے اگر ایک طرف اقبال جیسے شاعر ودانشور کو جنم دیا تھا تو دوسری طرف پریم چند جیسے فکشن نگار کو جو کتھا سمراٹ کہلائے۔ احتشام حسین اسی دوسری تحریک کے بڑے نقاد تھے اس لئے ان کی تنقید میں ایک بڑا فلک دکھائی دیتا ہے۔ یہ فلک اکبر کو جانچتے ہوئے بھی تاریخ وتہذیب میں پھیل جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں یہ سائنسی علم وشعور نسبتاً کم تھا۔ اکبر کے حوالے سے احتشام حسین نے غلط نہیں لکھا:

''اکبر کے پاس بھی حال کو سمجھنے کے لئے کوئی معقول علم نہ تھا وہ کبھی اپنے مشاہدے اور کبھی ماضی کی تاریخ سے اور زیادہ اپنے وجدان سے کام لیتے تھے اور تغیر کا علم رکھتے ہوئے بھی تغیر کی اصل نوعیت سے واقف نہ تھے۔ ان کا انقلاب کا تصور ایک زوال پذیر صوفی کا تصور تھا جو ذہنی قوت سے اپنے گرد وپیش کو بدل دینا چاہتے تھے۔''

فکر کا جو فرق انیسویں صدی اور بیسوی صدی کا تھا کم وبیش وہی فرق اکبر کی شاعری اور ترقی پسند تنقید کا تھا۔ اکبر ہر تبدیلی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے

تھے اور احتشام حسین تبدیلی کو ترقی اور فطری تبدیلی اور گہرے سماجی شعور کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ یہ ماڈی ارتقا ہے جو ہوکر رہتا ہے۔ ماضی بہرحال کروٹ لیتا ہے حال میں تبدیلی ہوتا ہے اور اس سے مستقبل کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ جب یہ فکری و نظری نظریہ نظر نہیں آتا تو اُس پر تنقید ہونے لگتی ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ تو بہت اچھی بات تھی کہ اکبر انقلاب کو بھی متحرک واقعہ تسلیم کرتے تھے لیکن وہ زمانے کو اپنے انداز نظر اور اپنی خواہش کا پابند بنائے رکھنا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ دنیا جیسی تھی ویسی ہی ہو جائے یا کم سے کم اتنا تو ہو کہ اب کوئی نئی بات اس میں ظہور پذیر نہ ہو۔''

انہیں خیالات سے پر مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''اکبر کا فن ان کے خلوص اور جوش کی وجہ سے غیر معمولی قوت رکھتا ہے اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اسے کسی انفرادی آسودگی کے لئے نہیں بلکہ اجتمائی آسودگی کے لئے استعمال کر رہے تھے حالانکہ جماعتی نقاد کا مادی تصور نہ ہونے کی وجہ سے وہ عملاً صرف ان کی انفرادی آسودگی تک محدود رہ جاتا ہے۔ یہی تضاد انھیں ناکامی اور شکست کا احساس دلاتا ہے جس کی تہہ تک وہ نہ پہنچ سکے۔''

اسی سلسلے کا دوسرا مضمون مجتبیٰ حسین کا ''اکبر الہ آبادی'' ہے جو ان کی کتاب تہذیب وتحریر میں شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین کا شمار بھی ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے۔

مضمون کی ابتدا میں ہی وہ کہتے ہیں کہ اکبر پر مضمون لکھنے کے لئے بڑے حوصلے بڑی امنگ کی ضرورت ہے ہنسی مذاق سے لطف لینے کی سکت چاہئے۔ یہ جملے اشارہ کرتے ہیں کہ فکری و نظری طور پر اختلاف رکھتے ہوئے کسی شاعر کی توصیف و تنقید کرنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔ جس کی غیر سنجیدہ شاعری میں سنجیدگی اور جس کی مغربیت میں مشرقیت پوشیدہ ہو اسے چھان کر نکالنا بڑا مشکل کام تو ہے ہی۔ یہ جملہ دیکھئے۔ فن کاری کے لحاظ سے یوں مضحکہ خیز طور پر شاعری کو برقرار رکھنا بہت مشکل ہے۔ ستاروں کو روک دینے والی چال اور گورنروں کو جھکا دینے والا ناز کوئی معمولی چیز نہیں۔ ''یہ خیال اس لئے بھی درست ہو سکتا ہے کہ طنز و مزاح عموماً عوامی اور سماجی زندگی میں ہی جھلکتا ہے۔ اس میں ڈوبنا ابھرنا پڑتا ہے۔ ایک طرف مجتبیٰ حسین اکبر کی اس طرح کی تعریف بھی کرتے ہیں:

''اکبر کے کلام میں موضوع اور اسلوب کی ہم آہنگی اس طرح پائی جاتی ہے کہ اردو کے چند گنے چنے شاعروں کو چھوڑ کر یہ فن کاری مفقود ہے۔''

اکبر کی زبان کی سبھی تعریف کرتے ہیں اسی لئے ان کو لسان العصر کہا گیا۔ فراق گورکھپوری نے تو اسی عنوان سے ایک عمدہ نظم بھی کہی ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کہ زبان و بیان کی تمام ترخوبیوں کے باوجود مجتبیٰ حسین یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے:

''اکبر عوامی زندگی کا سہارا لینے کے باوجود اس میں شریک نہ ہو سکے۔ وہ بذریعہ اصلاحِ خواص ''اصلاح عوام'' کرنا چاہتے تھے۔ انہیں شرفاء اور خواص کی تباہی اور پستی کا بڑا غم تھا۔ طبقہ ادنیٰ اس میں کہیں بھی شریک نہیں تھا۔''

مجتبیٰ حسین کے اس خیال سے کوئی اختلاف بھی کر سکتا ہے اس لئے کہ بدھو، جمن، رمضانی وغیرہ ادنیٰ طبقے سے ہی آتے ہیں لیکن اس کا جواز مجتبیٰ حسین یوں پیش کرتے ہیں کہ اکبر صوفی گھرانے سے آئے تھے اس لئے اکبر کی شاعری میں ایک مُلّا گھسا ہوا تھا۔ ''یہ مُلّا اتنا مذہبی نہیں ہے جتنا احیائی اور ماضی پرست ہے۔'' اسی لئے وہ ہر نئی چیز خواہ وہ کتنی اچھی ہو اکبر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اکبر کی یہی بات ترقی پسند نقادوں کو گراں گزرتی ہے اس لئے وہ اکبر کی فن کاری کے قائل ہوتے ہوئے بھی ان کی فکر سے اختلاف کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین پتے کی بات یہ بھی کہتے ہیں کہ ظرافت وطنز شاعر و فنکار کے گہرے سماجی شعور کے ساتھ چلتی ہے چونکہ اکبر کا سماجی شعور تغیرات کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا اس لئے ان کے کلام کا زمانہ بہت تیزی سے گذر گیا جس کا مجتبیٰ حسین افسوس کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''اکبر کے پاس یہ شعور تھا ضرور مگر نہ زمانے کے کام آ سکا نہ ان کے کام آ سکا۔ اس حادثے پر کس قدر دل ملتا ہے۔''

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''اکبر جیسا آدمی جو زبان اور بیان کے تمام حربوں سے لیس تھا۔ جس کے ذہن میں بلا کی شوخی اور طراری تھی یوں اپنے نظریہ کا شکار ہو کر بے بس اور مجروح ہو جائے۔''

یہ بھی لکھتے ہیں:

''آپ اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں اکبر کا مخالف ہوں۔ یا اکبر مجھے ناپسند ہیں۔ اردو شاعری میں اکبر جہاں کھڑے ہیں وہاں دور دور تک ان کے آس پاس کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ میں اکبر کی فنکاری کا منکر نہیں ان کی غلط نگاہی کا شاکی ہوں۔''

کیا معرکے کا آخری جملہ ہے جس میں خلوص۔ عظمت کا اعتراف، شکایت بھی کچھ ہے۔ اسی طرح کے معرکے کے جملوں پر مضمون ختم ہوتا ہے:

''ہمیں آج بھی ایک اکبر کی ضرورت ہے۔ جو پہلے والے اکبر کی طرح نہ ہو جو سفاکی سے موجودہ حالات کی قلعی کھول سکتا ہو۔ نئی زندگی کی بشارت دے سکتا ہو۔ ہم اکبر سے بہت کچھ لے سکتے ہیں۔ بہت کچھ سیکھتے ہیں ہمیں قدرت کلام کی ضرورت ہے جو ان کے پاس تھا۔ طنز و ظرافت کی آج بڑی ضرورت ہے۔ ہم روتی ہوئی دنیا کو ہنسا کر اس میں نئی جان پیدا کر سکتے ہیں مگر ہم میں وہ کس بل نہیں ہے جو اکبر میں تھا۔''

سنجیدہ ترقی پسند نقاد محمد حسن نے بھی اکبر پر ایک مضمون لکھا ہے جو یوپی اردو اکادمی کے اکبر نمبر میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان عجیب و غریب ہے ''اکبری تنقید اور تنقید اکبر'' حسن صاحب اکبر کی ایک بے حد عمدہ غزل کے چند اشعار سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''جس شاعر نے زندگی بھر ہنسی ٹھٹھول میں گزاری۔ ایسے ہنسی ٹھٹھول والے شاعر کے سینے میں ایسا دل بھی دھڑک رہا تھا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی حسرت نہیں باقی
ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں''

حسن صاحب کا خیال ہے کہ ایسی بیگانہ وشی اور بے تعلقی ظاہر کرنے والے شاعر کو انسان اور انسانی معاشرے کی کتنی فکر۔ یہ الگ بات ہے کہ زاویہ فکر مختلف ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اور حسن صاحب بھی اختلاف کرتے ہیں۔ اکبر کی دقیانوسیت کو ناپسند تو کرتے ہیں لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں۔ ''مگر لطف لے کر پڑھنے سے شاید احتراز کریں کہ زمانہ تعلیم کی باقیات میں سے ہے۔'' پھر وہ سوال قائم کرتے ہیں کہیں کہ:

''آخر یہ قضیہ کیا ہے کہ اکبر کا قدم ٹیڑھا پڑتا ہے؟''

پھر قیاساً جواب بھی دیتے ہیں:

''ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اکبر نے روایتی عشق و عاشقی کے مضامین یا تصوف اور خیر سگالی کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اس نئے طرز تمدن پر بھی توجہ کی اور پرانے اسالیب تہذیب کے از کار رفتہ ہونے پر دل کڑھا۔

اکبر کڑھتے تو رہے لیکن نئی تہذیب و تعلیم کو اپنانے پر مجبور بھی ہوئے۔ سرسید اور گاندھی کی تعریف بھی کی۔ طنز و مزاح ایک ایسی صنف ہے یا طریقہ کار جس میں شاعر منطقی باتیں کم ہنسی ٹھٹھول زیادہ کرتا ہے اور ہنسی ہنسی میں مذاق زیادہ اڑایا ہے جہاں سب قسم کی دلیلیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور صرف ہنسی باقی رہ جاتی ہے۔ اکبر کے یہاں صرف ہنسی نہیں رہتی بلکہ حسن صاحب کے خیال میں دبی دبی سی مزاحمت ابھرتی ہے اس مزاحمت میں منطق ہو یا نہ ہو لیکن ایک درد تو

ابھرتا ہی ہے۔ برگساں نے اس زندگی کی یکسانیات کے خلاف احتجاج تو کیا ہے لیکن اکبراسی یکسانیت کی شیرازہ بندی کے حمایتی تھے لیکن یہ بھی ہے کہ وہ ہر نئی چیز کے خلاف نہیں تھے لیکن قیمتی پرانے اقدار کے خاتمہ سے خوف زدہ بھی تھے۔ یہی بات محمد حسن بھی کہتے ہیں:

''اپنے معاشرے کے اسی دستور کی حفاظت اکبرالہ آبادی کرر ہے تھے اوراس تہذیبی تبدیلی کے خلاف اس کی مدافعت میں سرگرم تھے جوساری اقدارتمدن کے آگے سوالیہ نشان لگارہی تھی۔''

حسن صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ تہذیب کے بہاؤ میں ان کی مدافعت کتنی کارگر رہی۔ یہ الگ سوال ہے کہ سیلاب میں بہت کچھ بہہ جاتا ہے اور آپ اور ہم بے بس رہتے ہیں۔لیکن شاعری تو باقی رہتی ہے۔اکبر بھی باقی رہیں گے لیکن اپنے وقت اور عہد کے ساتھ تاریخ کے ایک مخصوص دور کی شناخت کے ساتھ۔عبوری دور کی ٹکراہٹیں مختلف النوع نظریات کے ساتھ باہم ٹکراتی ہیں۔جس میں جتنی طاقت اوراثر ہوتا ہے،سماج کو متاثر کرتی ہیں۔اکبر کے زمانے میں بھی یہی صورت تھی۔ایک طرف اکبر تھے دوسری طرف سرسید۔درمیان میں حالی شبلی بھی تھے۔نذیراحمد،سرشار،شرر بھی تھے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں۔لیکن غالب کوحسن صاحب نے کچھ اس طرح پیش کیا گویا وہ دونوں رخوں اور نظریوں کوقبول کرر ہے تھے۔مغربی کلچر کی بعض خوبیوں سے متاثر ہور ہے تھے خصوصاً کلکتہ کے سفر میں۔سرسید بھی متاثر ہوئے ایک الگ انداز میں اوراکبر نے سرکاری نوکری کرتے ہوئے اودھ پنچ کی مزاحیہ نظروں سے دیکھا۔تہذیبوں کا ارتقا ہوتا ہے ردوبدل بھی اورالٹ پھیر بھی لیکن کوئی تہذیب پوری قوم کوغلامانہ ذہنیت کا شکار بنادے اوراپنی تہذیب کو یکسر بھلادے اکبر کی فکروتشویش یہ تھی جسے انھوں نے فکر سے کم طنز سے زیادہ پیش کیا اس لئے وہ مزاح کے پیرائے میں ٹھٹھول بن کر رہ گئی۔فکر اور فطرت کے ٹکراؤ کو اکبرکم سمجھ سکے۔یہی بات حسن صاحب نے بلیغ تنقیدی پیرائے میں کہی۔لکھتے ہیں:

''غالب نے سرسید سے کہیں زیادہ بالغ نظری کا ثبوت دیا تھا جوسرسید کے بعد کے دور کے نقاد اکبرالہ آبادی سے نہیں بن پایا۔ انھوں نے عملی زندگی میں تو انگریزوں کی نوکری قبول کر لی۔ بیٹے کوانگریزی پڑھنے اور یورپی تہذیب اپنانے کولندن بھی بھیج دیا مگر شاعری میں دقیانوسیت کی کھکھوڑل ہی کو سینے سے لپٹائے لپٹائے زندگی گزاردی اورشاعری میں محدود زاویہ نظر کواپنالیا۔''

یہاں حسن صاحب قدرے سخت رویہ اپنالیتے ہیں۔ان کی تنقید کا اکثر رویہ دوٹوک اور بے باک ہوا کرتا ہے اس لئے وہ ترقی پسند تنقید کے گرم دل کا حصہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔عبوری دور کی کشمکش اجتماعی بھی ہوتی ہے اورانفرادی بھی اس کواسی تناظر میں لینا چاہئے۔غالب اور سرسید سے مقابلہ کر کے اکبر کوکم تر دکھانا اورکم کر کے دیکھنا تنقید کا وسیع سیاق تو ہوسکتا ہے لیکن ہرشخص وشاعر کا انفرادی وژن اور ذہن بھی ہوا کرتا ہے اسے بھی سمجھتے چلنے کی ضرورت ہے۔زمانے کا تضاد کبھی کبھی فرد کا تضاد بھی بن جاتا ہے اکبراسی کا شکار ہوئے ورنہ ان کے خلوص میں کمی نہ تھی۔زاویہ خلوص پر باتیں تو ہوسکتی ہیں اور ہونی بھی چاہئے۔ادب و تنقید اس ضمن میں پوری آزادی رکھتے ہیں جو باتیں راقم نے عرض کیں مضمون کے آخر میں حسن صاحب نے ایک دوسرے انداز میں یوں ظاہر کیں:

''ہم اپنے ادب میں مارک ٹوین ڈھونڈیں یا سوفٹ کا سراغ لگانا چاہیں یا لوہوسن کوتلاش کریں یا عبیدزاکانی کے طلب گار ہوں یا اور ہنری کی لذت کی خواہش مند ہوں لے دے کے ہمیں اکبر کی طرف آنا ہوگا۔ان سبھی کمزوریوں کے باوجود جوان کی نہیں ان کے دوران کے سماج کے تہذیبی مزاج کی کمزوریاں تھیں۔''

اور وہ پھراسی مقام پرلوٹ جاتے ہیں جہاں سے مضمون کی شروعات کی تھی یعنی ان کی غزل گوئی۔''بازار سے گزرا ہوں خریدارنہیں ہوں۔'' والی کیفیت جواردوشاعری کی صوفیانہ درویشانہ صفات سے میل کھاتی ہے۔گویا ترقی پسند نقاد کوبھی یہ قدیم تصوف بیگانگی پسند ہے اس لئے آخر میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

''اکبر نے اسی طرفگی سے زندگی گزاری۔طرفگی اور سرشاری کی یہی کیفیت وراثت میں بخشی کہ جس طرح انہوں نے اپنے زمانے کے تہذیبی رویوں پراپنے بے درد قہقہوں اور بے رحم طنز ومزاح سے تیر برسائے اسی طرح ہم آج اکبر کے رویے کوعقیدت کے پھول اورتنقید کے کانٹے نذر کریں کہ وہ آج بھی ہمارا حصہ ہیں۔ہم انھیں الماری کے اونچے خانے میں بٹھا کر بھول نہیں سکتے۔''

پروفیسر سید محمد عقیل کا شمار بھی صفِ اول کے ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے۔ اعجاز حسین کے شاگرد اور احتشام حسین کے رفیق کار کی حیثیت سے انھوں نے ترقی پسند افکار و اقدار کے بارے میں بہت کچھ سوچا لکھا۔ عقیل صاحب کی تنقید میں ان دونوں جید اساتذہ کے سایے نظر آتے ہیں۔ عقیل صاحب نے اکبر پر دو مضامین لکھے ہیں۔ اول اس وقت جب وہ ریسرچ اسکالر تھے جو ان کی پہلی کتاب نئی فکریں میں شامل ہے۔ اس مضمون پر فطری طور پر اعجاز حسین کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن دوسرا مضمون ''اکبر الہ آبادی، ایک عمومی مطالعہ'' ان کا سنجیدہ و معیاری مضمون ہے جو بعد کے دور میں لکھا گیا اس پر احتشام حسین کا اثر تو ہے لیکن بہت کچھ عقیل صاحب کا اپنا بھی ہے کہ اس وقت تک عقیل صاحب ایک بالغ نظر ترقی پسند نقاد کے طور پر اپنی پہنچان بنا چکے تھے اس لئے یہاں ان کے دوسرے مضمون پر ہی سرسری گفتگو کی جائے گی۔

مضمون کی ابتدا تاریخ و تہذیب کے اشاروں سے ہوتی ہے۔ ان تصادمات سے جو تہذیب کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک تبدیلی کو مثبت دیکھتا ہے اور دوسرا مہلک۔ عقیل صاحب اکبر کو دوسرے طبقہ سے جوڑتے ہیں لکھتے ہیں:

> ''ان سب تبدیلیوں کا ردِعمل یہ ہوا کہ وہ طبقہ جو پرانے خیالات و روایات میں کسی قسم کی تبدیلی کو مہلک سمجھتا تھا اور ایک طرح سے اس میں اپنی ہتک محسوس کرتا تھا۔ اکبر اسی طبقے کے سب سے بڑے حامی اور اس خیال و احساس کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔''

لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''اکبر کی شاعری کا اگر ایک صحیح اور غیر جانب دارانہ جائزہ لیا جائے تو مجموعی حیثیت سے ان کی شاعری مذہب کی زبردست پاسداری نئی تعلیم و تہذیب کی حد درجہ مخالف فیشن اور نئی ایجاد و تحریک سے منافرت کا اعلان ہے۔ وہ پرانی روایات میں تبدیلی کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔''

دونوں مثالوں میں ایک سے خیالات ہیں اور یہ بھی کہ عقیل صاحب غیر جانب داریت کی بات کرتے ہوئے بھی مضمون کی ابتدا میں جانب داریت کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ یہ جانب داریت تو اعجاز حسین و احتشام حسین کے رویوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ تاہم دیکھنا یہ ہے کہ آگے چل کر وہ اکبر کی شاعری کے بارے میں کیا اور کیسا متوازن رویہ اپناتے ہیں۔ دوسرے بڑے ترقی پسند نقادوں کی طرح وہ ایک بار پھر تاریخ و تہذیب کی طرف چلے جاتے ہیں۔ سماجی ترقی و تبدیلی اکثر مادی ترقی و تبدیلی سے وابستہ رہتی ہے۔ جیسے جیسے مادیت بڑھتی جاتی ہے فطری طور پر سماج روحانیت اور مذہبیت سے دور ہوتا جاتا ہے۔ ایسے میں ایک طبقہ جو مذہب یا مذہبی عقائد و تہذیب پر اعتماد رکھتا ہے وہ ہر تبدیلی کو مذہب کے لئے نقصان دہ اور مہلک سمجھنے لگتا ہے سماجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ کچھ مذہب میں بھی رسم و رواج داخل ہوتے جاتے ہیں جس کی مخالفت سرسید نے کی تو ایک طبقہ سرسید کی بھی مخالفت کرنے لگا۔ مذاق اڑانے لگا جس میں اکبر بھی شامل تھے عقیل صاحب کہتے ہیں۔'' کچھ یہ حقیقت بھی تھی کہ بہت سارے لوگ کشمکش میں پڑ کر مذہب سے لاپروائی برت رہے تھے۔'' یہی وجہ ہے کہ ایک طبقہ انگریزی تعلیم و تہذیب کا مخالف ہو گیا۔ اکبر بھی ہو گئے

چنانچہ بقول عقیل صاحب:

> ''اکبر کے نزدیک انسانی حیات اور اس کے تقاضے مذہب ہی کے محور پر گھومتے ہیں اور اس کے رہین منت ہیں۔ وہ بغیر مذہب کے کسی ترقی کسی زندگی کا تصور گناہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان چاہے جتنی ترقی کرے مگر اس میں اگر مذہب کی روشنی موجود نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔''

مذہبی ہونا غلط نہیں لیکن کٹر مذہبی ہو کر انسانی و سماجی ارتقا کو مذہب کے خلاف سمجھنا نہ صرف غور طلب ہے بلکہ بحث طلب بھی ہے۔ عقیل صاحب بے شمار ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں ان کی دلیل پوشیدہ ہے غور طلب بات یہ ہے کہ یہ اشعار غزل کے زیادہ ہیں اور اس عہد کے جب اکبر صوفیانہ رنگ کی غزلیں کہہ رہے تھے۔ مضمون کا بڑا حصہ اکبر کے انھیں خیالات و نظریات پر مشتمل ہے۔ درمیان میں کچھ دلچسپ جملے آتے ہیں۔ دیکھئے:

> ''وہ (اکبر) اس نکتے سے بے خبر تھے کہ متحرک زندگی واپس ہو کر پھر اس نقطے پر کبھی واپس نہیں پہنچ سکتی یا تو آگے بڑھے گی یا

کشاکش میں پیچھے جا گرے گی۔ وہ علم پدر آمدزگی آواز لگا رہے تھے۔ حالانکہ علم پدرزمانہ کی اختیار کا ساتھ دینے سے قاصر تھا اور وارثوں کے تقاضے میراث پدر سے بھی آگے کچھ تھے۔''

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''اگر چہ رجعت پسند طبقے کا خیال ہے کہ ادب کو مقصدیت وتبلیغ سے کوئی علاقہ نہیں مگر اکبر نے اپنے طبقے اور ماحول کے مقصد کی تبلیغ ادب کے ذریعہ کی اوراس کو سب مانتے ہیں۔''

''سب مانتے ہیں'' میں عقیل صاحب بھی ہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ احتشام حسین وآل احمد سرور کی طرح اس ایجاب وتسلیم پر کھلی بحث نہیں کرتے ہیں اور نہ مثالیں پیش کرتے ہیں البتہ یہ ضرور کہتے ہیں:

''اکبر نے اس وضعداری کو خوب نبھایا اوراس میں اکبر کے عصری لوگ ان کے ساتھ تھے اگر شاعر اپنے وقت اور ماحول کا ترجمان ہے تو اکبر نے اپنے ماحول اور وقت کی ترجمانی ضرور کی۔''

لیکن یہ اعتراف مختصر اور سرسری ہے۔مضمون کی تان اکبر کی ناکامی پر ٹوٹتی ہے اس لئے بھی ان کا خیال ہے کہ ''اکبر مفکر اور دور بین نہ تھے۔'' اس پر دوبارہ غور وفکر ہوسکتی ہے اس لئے کہ اکبر نے جس مادیت اور بازاروادکی مخالفت کی تھی۔ہم آج اس کے گھیرے میں قید ہیں۔ ہر چیز بازار کا حصہ بن گئی ہے۔ ادب سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب پر بھی اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں ایسے میں اکبر کو جو خطرات نظر آرہے تھے اس کے پیش نظر ان کو مفکر و دانشور نہ سہی لیکن تہذیب شناس اور مستقبل شناس تو کہا ہی جاسکتا ہے۔ان اشعار کو بغور ملاحظہ کیجئے

یہ موجودہ طریقے راہئ ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کنبہ بنے گا مغربی پہلے صنم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

پوری غزل میں ایک سچا درد اور ایک پاکیزہ خلوص کے ساتھ اکبر کی تہذیب شناسی اور مستقبل شناسی کے عناصر بھرے ہوئے ہیں۔اکبر کی فکر سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے ترقی پسند تنقید میں بطور خاص عقیل صاحب نے بھی کیا۔لیکن اس مضمون میں وہ اکبر کی شاعرانہ عظمت کا ذکر کم کرتے ہیں حالانکہ وہ گفتگو میں اکبر کو ایک بڑا شاعر تسلیم کرتے رہے ہیں الہ آباد میوزیم کے زیر اہتمام جو انھوں نے ''الہ آباد کی تہذیب وشاعری'' پر خطبے دئے ہیں جو ہندی میں شائع بھی ہو چکے ہیں اس میں وہ اکبر کی شاعری وفنکاری کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔لیکن یہ مضمون اس مدح سے خالی ہے۔ چنانچہ یہ مضمون ان کی علمی وسعت کا اظہار تو کرتا ہے لیکن ان کی طے شدہ فکر کی غمازی بھی کرتا ہے۔اسی نازک موڑ پر وہ اعجاز حسین اور احتشام حسین سے نہ صرف مختلف ہو جاتے ہیں کہیں کہیں منفرد بھی۔

قمر رئیس یوں تو اردو میں فکشن کے عمدہ نقاد کے طور پر جانے گئے لیکن انھوں نے وقتاً فوقتاً شاعری اور شاعروں پر بھی مضامین لکھے ہیں لیکن ان میں

بھی زیادہ تعداد ترقی پسند شاعروں کی ہے۔ کلاسیکی شاعروں پر ان کے مضامین بے حد کم ہیں۔ اکبر پر لکھا ہوا یہ مختصر سا مضمون فکر وتحقیق کے اکبر نمبر کے لئے فرمائش کے طور پر لکھا گیا۔ قمر رئیس اعلیٰ درجہ کے پریم چند شناس کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ یہ مضمون بھی پریم چند کے چند جملوں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ میں نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اکبر اکلوتے خوش نصیب شاعر ہیں جس پر پریم چند با قاعدہ مضمون لکھتے ہیں۔ قمر رئیس پریم چند کے اس مضمون کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں کہتے ہیں کہ پریم چند تاریخ کے طالب علم تھے اس لئے وہ بھی نشاۃ ثانیہ کو ایک نازک دور مانتے ہیں کہتے ہیں۔ ''پریم چند نے اسے عظیم تہذیبی کشمکش اور افراط وتفریط کے عہد کا نام دیا ہے۔'' اس نازک موڑ پر اردو میں جو بڑے ادیب وشاعر پیدا ہوئے قمر رئیس حالی شبلی، نذیر احمد کے ساتھ اکبر کا بھی نام لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اس عہد میں جو مادی ترقیاں ہو رہی تھیں ان کے قیام کا مقصد ہندوستان کی تعمیر وترقی کم برطانوی اقتدار کا استحکام زیادہ تھا اور بقول قمر رئیس۔ ''یہ سچائی اکبر پر بھی روشن تھی، لیکن ساتھ میں وہ یہ بھی طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

''لیکن ان کی دورخی سوچ کا عجیب پہلو یہ تھا کہ نئی تعلیم اور نئی روشنی کی تمام نعمتوں سے بھر پور فائدہ اٹھاؤ لیکن ان پر لعنت بھیجنے میں بھی تاخیر یا تامل نہ کرو۔''

قمر رئیس دیگر ترقی پسند نقادوں کی طرح معترض تو ہوتے ہیں لیکن وہ سوال بھی قائم کرتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ اس مذمت یا مخالفت کے پیچھے اصل محرک کیا تھا؟''

یہ مختصر مضمون انھیں محرکات کی طرف اشارے کرتا ہے دو اشارے بطور خاص۔ اول ان کا گھریلو ماحول۔ بچپن کی مذہبی تعلیم صوفیانہ تربیت جس کی وجہ سے بقول قمر رئیس۔ ''جس کے نتیجے میں مذہب یعنی اسلام کے تحفظ کا جذبہ ان کی جذباتی اور معنوی شخصیت میں گہرائی سے جاگزیں ہو گیا تھا۔'' دوسری بات جو اکبر کے ذہن میں بیٹھ گئی تھی وہ یہ کہ انگریزی پڑھ لینے کے بعد ہندوستانیوں کو بالخصوص مسلمانوں کو صرف کلرکی چپراسی گیری اور غلامی ہی مل سکے گی۔ اب یہ خیال اکبر کے ذہن میں غلط تھا یا صحیح۔ بہر حال قمر رئیس انھیں بنیادوں پر گفتگو کرتے ہیں اور اشعار بھی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکبر کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جس میں ان کے وسوسوں اندیشوں نیز دردمندی کا اظہار ملتا ہے۔ ایک بات اور بڑی پتے کی قمر رئیس لکھتے ہیں:

''اکبر قومی یا تہذیبی شناخت پر بے شک زور دیتے ہیں لیکن یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ان لوگوں کے قریب تھے جو قومی شناخت میں دینی شناخت کے عنصر کا لازمی سمجھتے تھے۔''

لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''اگر چہ یہ صحیح بھی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا اکبر نشاۃ ثانیہ کے ساتھ نئی تعلیم کے نظام کے قائل ہوتے جارہے تھے۔''

اس کے بعد وہ پھر مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اور آخر میں یہ بھی کہتے ہیں:

''اکبر بلاشبہ ایک نازک عبوری دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ایسا دور جس میں تہذیب وتعلیم کے جدید ادارے باہمی طور پر متصادم تھے۔ اس آویزش نے فرد اور معاشرہ دونوں کی اندرونی دنیا میں بھی کشمکش ہی نہیں پریکار کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اکبر کے نقاد دیگر تحریروں میں یہ سوال کثرت سے اٹھاتے ہیں اور قارئین کے دلوں میں بھی اسی طرح کا ہیجان اور بکھراؤ پیدا کر دیتے ہیں جس نے اکبر کے وجود میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔''

ایک اور ترقی پسند نقاد ہیں پروفیسر افصح ظفر جنھوں نے اکبر پر پوری کتاب لکھی ہے جو ایک الگ اور مفصل تجزیہ کا حق رکھتی ہے۔ ترقی پسندوں کے یہ مقالات بحیثیت مجموعی صاف اعلان واطباء کرتے ہیں کہ اکبر کی غیر ترقی پسند فکر سے ان سبھی کو اختلاف رہتا ہے لیکن ان میں سے بعض اکبر کی مجبوری اور دردمندی کو سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں سمجھتے لیکن اس سمجھ اور ناسمجھ کے باوجود اکبر کو بڑا شاعر تو تسلیم ہی کیا گیا۔ یہ ترقی پسند تنقید کی وسعتِ فکری ہو سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اعتراف میں ان کی لسانی چابک دستی اور شاعرانہ ہنرمندی کا دخل زیادہ ہے۔ ترقی پسند تنقید کی یہ خوبی یا خرابی رہی ہے کہ وہ فکر وفلسفہ پر باتیں زیادہ کرتی ہے۔ لسان اور زبان وبیان پر کم۔ غالبًا اسی لئے ترقی پسند فکر کے ردعمل میں جدید فکر نے حرف ولفظ، زبان وبیان، خیال بندی اور معاملہ بندی وغیرہ پر

زیادہ زور دیا۔ خیر یہ الگ بحث ہے۔ کوئی بھی عہد ہو یا تہذیب۔ شعر و ادب ہو یا طنز و مزاح، ہر عہد میں شخص و شاعر اپنے اپنے اتحادِ فکر Association of Thoughts کے ساتھ فکر و فن کو برتا ہے اور انسان کی فکر مختلف بھی ہوتی اور مشترک بھی۔ اس اختلاف و اشتراک کو پوری وسعت اور دردمندی سے لینا چاہئے۔ مجنوں گورکھپوری کے ان جملوں پر گفتگو ختم ہوتی ہے:

''ادیب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔ ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیئت اجتماعی ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کوئی دوسرا فرد اور ادب بھی ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات۔ ادیب کو خلاّق کہا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ایک قادرِ مطلق کی طرح صرف ایک ''کن'' سے جو جی چاہے اور جس وقت جی چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے اس میں شک نہیں کہ ایک اندرونی اپج سے مجبور ہر کر کہتا ہے جو بظاہر انفرادی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ اپج ان تمام خارجی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو مجموعی طور پر تمدن یا ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ شاعر کی زبان الہامی زبان مانی گئی ہے لیکن یہ الہامی زبان در پردہ ماحول اور زمانے کی زبان ہوتی ہے۔'' (بحوالہ ترقی پسند ادب از سردار جعفری)

اکبرالہ آبادی کی نظمیہ شاعری

اکبر کے تعلق سے بہت سے لوگوں نے مضامین لکھے ہیں۔ پرانے لوگوں میں رشید احمد صدیقی، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، جعفر علی خاں اثر اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے حضرات نے خاص طور سے ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن ان مضامین میں یا تو اکبر کی شاعری کے موضوعات کے تنوع کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، یا طنز و مزاح اور ظرافت و بذلہ سنجی سے، یا پھر ان کے یہاں تہذیبوں کے ٹکراؤ اور ان کی نئی لفظیات سے۔ اصناف کے لحاظ سے ان کے قطعات اور ان کی رباعیوں اور غزلوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ بعد کے لوگوں نے بھی تقریباً انھی موضوعات کو اپنی تحریروں کا حوالہ بنایا ہے البتہ ان کے نظریۂ عورت کے حوالے سے اور نئی تہذیب کی ناپسندیدگی کے تعلق سے چٹخارے دار مضامین لکھے، مگر ان کی نظم نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ ہاں پروفیسر افصح ظفر نے اکبر کی نظم نگاری سے کافی حد تک انصاف کیا ہے۔ اکبر کی نظموں کو نظر انداز کیے جانے کی ایک وجہ شاید یہ رہی کہ انھوں نے اپنی زندگی کے پہلے آدھے حصے میں صرف غزلیں ہی کہیں اس لیے ان کی نظموں کی طرف عام لوگوں کی نظر اور ناقدوں کا ذہن کم گیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ان کے طنزیہ، مزاحیہ اور ظریفانہ موضوعات و اسلوب اتنے شوخ اور ایسے اثر انگیز تھے کہ لوگ اس جادو سے باہر نہیں نکل پائے اور انھوں نے بس اپنے مطلب کے اشعار ڈھونڈنے پر اکتفا کی۔ تیسری وجہ یہ کہ انھوں نے بیشتر نظموں پر عنوانات نہیں لگائے جس کی بنا پر ایسی نظمیں قاری کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکیں۔ حالانکہ اکبر نے بڑی تعداد میں نظمیں کہی ہیں اور متعدد موضوعات پر کہی ہیں۔

روایت یہ ہے کہ 1877 میں جب منشی احمد حسین نے اپنے مشہور زمانہ اخبار 'اودھ پنچ' کا اجرا کیا تو اس موقع سے اکبرالہ آبادی نے ان کے نام ایک منظوم خط لکھا۔ اسی منظوم خط سے اکبرالہ آبادی کی باضابطہ نظم نگاری بھی شروع ہوتی ہے اور ان کے طنز و ظرافت کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ چار مصرعوں والی رباعی اور دو دو اشعار والے قطعے پہلے بھی کہتے رہے تھے۔ یہ منظوم خط اکبر کے کلیات میں 'نامہ بنام مدیر اودھ پنچ' کے عنوان سے موجود ہے۔ مثنوی کی بحر میں لکھی ہوئی یہ طویل نظم ایک سو چودہ اشعار پر مشتمل ہے۔ گو کہ اکبر کی یہ پہلی نظم ہے مگر فنی اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔ تمام مصرعے ایک دوسرے سے مربوط فطری طور پر آگے بڑھتے ہوئے انجام کو پہنچتے ہیں۔ نظم کی روانی اور ظرافت اکبر کی حسِ مزاح اور زبان پر ان کی قدرت کی گواہی دیتے ہیں۔ اور شاید یہ کہنا بالکل غلط نہ ہوگا کہ اکبر کی اچھی اور کامیاب نظموں میں سے ایک، ان کی یہ پہلی نظم بھی ہے۔

اس منظوم خط 'نامہ بنام مدیر اودھ پنچ' کے بعد سے ایسا لگا جیسے اکبر غزلوں سے منھ موڑ کر نظموں کے ہی ہو رہے۔ انھوں نے کثرت سے نظمیں لکھیں۔ یہاں تک کہ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام 25 جولائی 1919 کے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تین ہزار سے زیادہ نظمیں بیاضوں میں موجود ہیں۔ حصہ سوم کے لیے پبلک کا بڑا تقاضہ ہے۔ حیران ہوں کہ ترتیب و انتخاب کیوں کر ہو۔'' (رقعات اکبر، مرتبہ محمد نصیر ہمایوں، لاہور، ص، 38) سید افتخار حسین کو 10 جولائی 1919 کے خط میں لکھتے ہیں کہ: '' حصہ سوم کی ترتیب و تہذیب میں مصروف ہوں، مشیر کوئی نہیں۔ قریب 2600 (دو ہزار چھ سو) کے نظمیں ہیں۔'' (ایضاً، ص، 64) ظاہر ہے ان نظموں میں ان کے قطعات بھی شامل ہیں۔ ان کی نظمیں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ زیادہ تر نظمیں غزل کے فارم ہیں۔ کچھ نظموں میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ بہت سی نظمیں فنی معیار کے لحاظ سے مکمل اور منضبط ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن پر مسلسل غزل کا گمان ہوتا ہے۔ کچھ نظمیں باضابطہ عنوان کے تحت لکھی گئی ہیں اور ایسی نظمیں بھی خاصی تعداد میں ہیں جن کے اوپر انھوں نے کوئی عنوان نہیں لگایا ہے۔ اکبر کے یہاں تقریباً سو نظمیں ایسی ہیں جو محض تین اشعار پر مشتمل ہیں۔ یہ نظمیں رباعی کے چار مصرعوں اور غزل کے قطعہ بند دو اشعار سے یوں مختلف ہیں کہ یہاں مضمون یا خیال کی تکمیل چار کے بجائے چھ مصرعوں میں ہوتی ہے۔ یہ نظمیں غزل اور مثنوی کی ہیئتوں میں ہیں۔ اس طرز اسلوب کو اکبر کی جدت پسند طبیعت کی اپج سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مثال ملاحظہ کیجیے:

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے — دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے

جب خود نہیں رہنے کے کسی اصل پہ قائم — کیا خاک وہ قائم کوئی بنیاد کریں گے

پروفیسر ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ ۷

بارک کوئی کردے گی عطا ان کو گورنمنٹ   یا کالونی کوئی اپنی آباد کریں

اکبر کے یہاں اچھی نظمیں بھی ہیں اور کم اچھی بھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی کامیاب نظموں میں ایسی نظموں کی تعداد زیادہ ہے جو بلاعنوان ہیں۔ سو، ان کی نظموں کی طرف توجہ نہ دیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ناقدوں نے 'برق کلیسا'، 'جلوہ دربار دہلی'، 'کرزن سبھا' اور 'گاندھی نامہ' کے مقابلے میں بلاعنوان نظموں کے موضوعات طے نہ کر پانے کے باعث انھیں نظرانداز کیا جس کی وجہ سے ان نظموں کی خوبیوں کا جیسا بیان ہونا چاہیے تھا نہیں کیا گیا۔ کلیم الدین احمد ان کی ایک بلاعنوان نظم جو یوں شروع ہوتی ہے:

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں   اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں
بھولی خوش رنگ جست نازک پیاری   پہنے ہوئے فطری منقش ساری

کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''کس سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے تیتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ تصویر رسمی نہیں۔ اکبر اس منظر سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ تصویر ایسی حسین اور موثر ہے۔ کاش وہ اس قسم کی نظموں کی طرف توجہ کرتے۔''
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر، ص 71)

اکبر اپنی نظموں میں تضادات سے بہت کام لیتے ہیں۔ مثلاً مشرق و مغرب کا تضاد، نئی اور پرانی تہذیب کا تضاد، مذہب اور لا مذہبیت کا تضاد، خیر اور شر کا تضاد، شوہر و بیوی کا تضاد، چھوٹے بڑے کا تضاد، صاحب اور ملازم کا تضاد اور عام اور خاص کا تضاد۔ اس تضاد کی وجہ سے ہی ان کی شاعری میں واقعے، کردار اور عمل کے دونوں رخ یا پہلو زیادہ نکھر کر اور زیادہ شدت سے سامنے آتے ہیں۔ کہنا چاہیے کہ نظموں میں تضادات کا اتنا ہنرمندانہ، دلچسپ اور اثر انگیز استعمال کم فنکاروں نے کیا ہے۔ ان کی بیشتر نظموں میں طنز و ظرافت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی پیغام، کوئی نکتہ یا فلسفہ پوشیدہ ہوتا ہے یا بین السطور اصلاحی اور اخلاقی پہلو رہتا ہے۔ ملا واحدی کے نام وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں: ''ایسی ظرافت جو نری ظرافت ہو اور اس کے اندر کوئی اخلاقی نصیحت نہ ہو یا کوئی نکتہ مذہبی سوشل یا فلسفیانہ نہ پیدا ہو، کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔'' (بحوالہ علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، 1950، ص، 30) لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ یہ پیغام پروپیگنڈہ یا تبلیغ کے طور پر یا ناصحانہ اور بزرگانہ انداز میں نہیں دیتے، بلکہ بڑی فنکاری کے ساتھ انڈائرکٹ طریقے، یا تقابل کی صورت یا پھر ڈرامائی تکنیک کے ذریعے شاعری میں اس طرح سموتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے جیسے بات سے بات اپنے آپ پیدا ہوئی ہے۔ یہ بات بہت ہی اہم ہے کہ ان کے طنز و ظرافت میں زیرلب مسکراہٹ، میٹھی سی گدگدی اور ذہن و نظر کو متوجہ کرنے والی ایک خوش رنگ روشنی اور شگفتہ آواز ہوتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں کسی طرح کی تضحیک، تذلیل، حسد، کینہ اور بغض نہیں ہوتا۔ ہاں اس پردے میں آہ، افسوس، دکھ، زیاں، چٹخارے، کاٹ اور چُہل کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہ طنز و مزاح کی وہ ہنرمندی ہے جسے اکبر جیسا فنکار ہی سنبھال سکتا تھا۔ البتہ جہاں بات براہ راست کہنے اور کسی حد تک کھلے لہجے کی ضرورت ہوئی تو اس سے بھی اکبر نے گریز نہیں کیا۔ عورت کے حوالے بعض نظموں اور 'گاندھی نامہ' میں اس کی نشاندہی بہ آسانی کی جاسکتی ہے۔

اکبر کی نظموں میں واقعہ نگاری، مکالمہ بندی، مناظر کی عکاسی، پیکر تراشی اور ڈرامائی عناصر کی بہتات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری حسِ مزاح اور جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ حواسِ خمسہ کے بھی بیشتر حسوں کو بیک وقت بیدار کرتی ہے۔ انھیں چھوٹے کینوس پر بڑے مناظر پینٹ کرنے کا ہنر اور دجلہ میں فرات دکھانے کا فن خوب آتا ہے۔ مختصر نظموں میں بلند خیال بیان کرنے کا رمز اور نئی اصطلاحوں اور معمولی الفاظ کی مدد سے روایات و نظریات کے بکھان کا بھید جیسا اکبر جانتے تھے کم شاعر جانتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ اکبر کے نظریات سے اتفاق یا اختلاف کیا جائے، لیکن انھوں نے اپنے نظریوں کو مختلف تکنیک کے ذریعے جس سلیقے سے بیان کیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

نظموں میں کردار کی تلاش کو خوب نہیں کہا سکتا، کہ فکشن کی طرح یہاں کرداری نگاری کی زیادہ گنجائش ہوتی بھی نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخی، اسطوری، مذہبی، سیاسی اور محبوب شخصیتوں کے حوالے سے اردو میں کافی نظمیں لکھی گئیں۔ علامہ اقبال، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی درگا سہائے سرور جہان

آبادی اور پنڈت آنند نرائن ملاّ کے یہاں اس کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔یوں عمومی باتوں اور واقعات وعمل کے لیے اکبر کی نظموں میں چھوٹے، بڑے، خاص، عام، اہم اور غیر اہم کرداروں کی ایک کہکشاں نظر آئے گی جس میں شیخ، مولوی، پنڈت، برہمن، لاٹ صاحب، سیٹھ جی، انگریز، بیگم، بی بی، مس، بوڑھا، لالہ، نیٹو، جمن، گھورن، کلو وغیرہ سے ملاقات کی جاسکتی ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ ملاقات کے وقت کسی بھی کردار کی صورت نظر نہیں آتی اور ملاقات کے بعد ان کی سیرت بھول نہیں پاتی۔اکبر کی فنکاری یہ ہے کہ وہ محض چند لفظوں اور کبھی کبھی تو صرف ناموں کے انتخاب سے ہی کرداروں کی ایسی سیرت بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اپنے اپنے طور پر ان کی مدد سے ذہن میں کردار کی صورت ہی کیا، ایک جیتی جاگتی مجسم شخصیت بنالیتا ہے۔

جن اہم شخصیتوں پر اکبر نے نظمیں لکھی ہیں ان میں سر سید احمد خاں، پنڈت مدن موہن مالویہ، مولانا محمد علی جوہر، لالہ لاجپت رائے، علامہ شبلی نعمانی، مہاتما گاندھی اور کرزن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اکبر کے کرداروں کے تنوع سے اکبر کے سماجی سروکار، ان کے نفسیاتی شعور اور حالات وواقعات سے ان کی واقفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سماج کے مختلف طبقوں کے احوال، تحریکات وواقعات، ان سے وابستہ اہم شخصیات اور ان کی نفسیات سے انھیں کس درجہ دلچسپی تھی۔اکبر کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں انھوں نے انسانی نفسیات، سیاسی حالات اور بعض اہم امور پر بڑے بلیغ اشارے کیے ہیں:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

گائیں سبزہ پاگئیں کر کے کلیل
اونٹ کانٹوں پر لٹکتے ہی رہے

قصیدے سے نہ چلتا ہے ، نہ یہ دوہے سے چلتا ہے
سمجھ لو خوب، کارِ سلطنت لوہے سے چلتا ہے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہنگامۂ محشر کا تو مقصود ہے معلوم
دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں

ناچ ہے مغرب کا بزم دہر میں
جھومتے ہیں مشرقی بیٹھے ہوئے

خوب فنِ حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لیے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل

یاروں کی دوڑ دھوپ ہے دنیا کی چیخ پر
اور دین ہے کباب ضرورت کی سیخ پر

پنڈت کو بھی سلام ہو اور مولوی کو بھی
مذہب نہ چاہیے مجھے ایمان چاہیے

کہنے کی ضرورت نہیں کہ اکبر بڑے ہی دیندار اور مذہبی انسان تھے۔دکھاوے، ظاہر داری، ضد اور عیاری کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔چنانچہ اردو شاعری کی روایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے ظاہر پرستی، کج بحثی اور انانیت پسندی کی علامتوں بطور خاص مولوی، ملا، پنڈت، گرو، برہمن، زاہد اور شیخ کو اپنی ظرافت کا خوب نشانہ بنایا ہے، بلکہ ویسا اور اُتنا ہی، جتنا اور جیسا انھوں نے معاشرے کی غیر ضروری مغرب پرستی اور عورتوں کی بیجا آزادی کو اپنے طنز کا

نشانہ بنایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

قُل قل شیشہ کو سنیے تو ذرا حضرت شیخ
دیکھیے تو کہیں اس قل میں 'ہواللہ' نہ ہو

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

پوچھا کہ شغل کیا ہے؟ کہنے لگے گرو جی
بس رام رام جپنا چیلوں کا مال اپنا

بحث میں مولوی نہ ہاریں گے
جان ہاریں گے جی نہ ہاریں گے

گھلایا شیخ کو اس شوخ کے شیریں تکلم نے
مٹایا زہد کی خشکی کو اک موج تبسم نے

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دیں
گھیر ہی لیں گے پولس والے ،سزا ہو یا نہ ہو

مذہب چھڑایا عشوۂ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر پڑے

پریس میں شیخ ہیں ،مسجد اجاڑ ، ایوان خالی ہے
کتب خانہ بھراجاتاہے اور میدان خالی ہے

ابھرے ہیں عیب ان کے اور خوبیاں دبی ہیں
بے دین اگر نہیں ہیں، تو شیخ جی غبی ہیں

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر، کود اچھل آیا

خوب لڑوایا بہم دل کھول کر
مار ڈالا راویوں نے قوم کو

المیہ یہ ہے کہ ہمارے ناقدوں کی تحریروں میں نظیرا کبرآبادی کی طرح اکبرالہ آبادی اوران کی شاعری بھی افراط وتفریط کا شکار ہوئی۔ایک گروہ نے انھیں اوران کی شاعری کوعورتوں کی تعلیم اوران کی آزادی کا دشمن قرار دیا اور مغربی تہذیب کا بدترین مخالف کہا،تو دوسرے گروہ نے ان کواوران کی شاعری کو مشرقی تہذیب کا حامی اور پاسدار بتایا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر بالخصوص نظموں کا شاعر اپنی شخصیت کے اظہار کے علاوہ سماج، معاشرے اور بدلتے حالات کا مصور بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی۔ وہ ترجمان بھی ہوتا ہے اور تجزیہ نگار بھی۔ وہ مبلغ کی طرح کسی ایک نظریے کی تلقین نہیں کرتا اوراچھائیوں کا مجموعہ بتاتے ہوئے اسے اپنانے پراصرار نہیں کرتا۔ بلکہ شاعرایک معلم کی مانند تمام نظریات کواس کی خوبیوں اورخامیوں کے ساتھ بیان کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کواخذ و اختیار کی مکمل آزادی دیتا ہے۔اگر اکبر کی تمام شاعری کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اکبر نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مبلغ یا مفکر بن کر نہیں آتے ۔وہ ملک وقوم کے مصور،مبصر،مترجم اورمعلم کی حیثیت سے آتے اورلوگوں کے سامنے چیزوں کو جوں کا توں رکھ دیتے ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ

دونوں رخوں کو دکھایا ہے۔ مشرقی تہذیب کے ساتھ مغربی تہذیب کو۔ عورتوں کی مکمل آزادی کے ساتھ ان کی مشروط آزادی کو۔ مذہب کے ظاہر کے ساتھ اس کے باطن کو اور سیاستدانوں کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خرابیوں کو بھی۔ اکبر کی فنی ہنرمندی یہ ہے کہ انھوں نے فکر، خیال اور واقعے کو شیریں، شگفتہ اور شوخ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی ان کے فکر یا خیال سے اتفاق رکھے یا نہ رکھے، طرزِ اظہار سے ضرور لطف اندوز ہوگا، اور دراصل شاعری کا کام بھی یہی ہے۔ پھر یہ کہ ان کی شاعری اشتہار کا کام نہیں کرتی، جیسا کہ ہمارے ناقدین سمجھتے ہیں، بلکہ ان کی شاعری ایک التباس پیدا کرتی ہے۔ 'ہاں' اور 'نا' کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے، اختیار اور انکار کے وہم میں ڈالتی ہے۔ یا غالب کی زبان میں کہیے کہ ''ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر'' والی سچویشن میں لا کھڑا کرتی ہے۔ آیئے ان سب سے الگ اکبر کے کچھ خوبصورت اور دلچسپ اشعار سے لطف اندوز ہوتے ہیں:

نگاہیں ، چتونیں ، عشوے ، کرشمے
اُدھر اتنے ، اِدھر تنہا مرا دل

بعد مدت کے جو تقریر بھی کی تم نے تو
جس کے معنی نہیں، مطلب نہیں ، مفہوم نہیں

کرگئی کام نگاہِ مسِ پُر فن کیسا
تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

نہیں بدلی زباں اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے
میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں، سِٹ ڈاؤن کہتی ہے

میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا
نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مِسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے
اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

جناب اکبر سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

جو حرا کے جاننے والے تھے صوفی ہو گئے
داستان بدر والے شیعہ سنی ہو گئے

آتا ہے وجد مجھ کو ہر دین کی ادا پر
مسجد میں ناچتا ہوں ناقوس کی صدا پر

باپ ماں سے، شیخ سے، اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے

تری پالسی کا حال تو کھلتا نہیں صاحب

ہماری پالسی تو صاف ہے ایماں فروشی کی
مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو ،عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت ،توبہ توبہ
رات اُس مِس سے کلیسا میں ہوامیں دوچار
ہائے وہ حسن ،وہ شوخی ،وہ نزاکت ،وہ ابھار

سارتر نے کہیں لکھا ہے کہ شاعر زبان کے روایتی استعمال سے انکار کرتے ہیں۔ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ نثر کے مقابلے شاعری میں حسن بیان اور حسن خیال دونوں کا پاس ولحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر شاعر روایتی زبان کے استعمال کا ہی پابند رہے تو ممکن نہیں کہ وہ نئے خیالات ومضامین کا مکمل اظہار کر پائے اور بدلتے حالات اور تبدیل ہوتے زمانے کی نمائندگی پر قادر ہو سکے۔ ہر بدلتا ہوا عہد اپنے ساتھ نئے خیالات وموضوعات اور نئے مضامین واسالیب لے کر آتا ہے جس کے اظہار کے لیے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحوں کی بہر طور ضرورت ہوتی ہے۔ اکبر اس راز سے واقف تھے اور نظیرا کبرآبادی کی جدت پسندی ،دور اندیشی اور قادرالکلامی کے قائل تھے۔ سو،انھوں نے بھی زبان کے معاملے میں روایت پرست شاعروں کے بجائے بغاوت پسند نظیرا کبرآبادی کے مسلک کو اختیا کیا اور اردو شاعری کو نئے،انوکھے الفاظ اور نئی طرز سے ثروت مند بناتے رہے۔ اکبر کے خیال میں معنی کی ادائیگی کے لیے شاعر کو لفظوں کے انتخاب اور استعمال کی آزادی ہونی چاہیے جسے انھوں نے بلا تکلف برتا بھی۔ ان اشعار سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہے:

نقش صورت ہی کی تزئیں پہ رہی جس کی نظر
اُس سخن سے حسنِ معنی یک قلم جاتا رہا
شعر اکبر میں کوئی کشف وکرامات نہیں
دل پہ گزری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں
اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے
اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے

ظاہر ہے اکبر کا مقصد زبان کی روایتی پابندیوں کے مقابلے میں شاعری کو اظہار ذات وکائنات کا وسیلہ ہونا چاہیے۔ اور زبان کی تزئین کے مقابلے میں شاعری کو اثر انگیز اور ذہن ودل کو برانگیخت کرنے والا ہونا چاہیے۔ گویا وہ شاعری میں حسن الفاظ پر معنی کی ترسیل کو ترجیح دیتے ہیں اور روایتی زبان کی پابندی پر خیال کی جدت،موضوعات کے تنوع اور نئے الفاظ کی شمولیت کو:

معنی کو ضرورت نہیں الفاظ کی اکبر
سب جانتے ہیں حسن صدا اور ہی کچھ ہے
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھیں جناب شیخ
جس وقت جو خیال ہے، مذہب بھی ہے وہی
چھوڑ دہلی لکھنؤ سے بھی نہ کچھ امید کر
نظم میں بھی وعظِ آزادی کی اب تائید کر
صاف ہے، روشن ہے اور ہے صاحب ِسوز وگداز
شاعری میں بس زبان شمع کی تقلید کر

حسن بیان اور اظہار خیال کے تعلق سے اکبر نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ دیکھیے:

''حسن زبان اورحسن خیال دونوں کے امتزاج سے عمدہ شعر پیدا ہوتے ہیں۔... یادرکھنا چاہیے کہ اگر ردیفوں کا چمکنا اور نہایت بے تکلف طور پر ان سے معنی کا پیدا ہونا اور ان کا بامحاورہ ہونا مقبولیت شعر میں نہایت درجہ کو موثر ہے لیکن درحقیقت ردیفوں کو ہی چمکا کر داد لینا اور اسی پر قناعت کرنا اور زبان ہی کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنا دلیل اس بات کی ہے کہ شاعر عمدہ خیالات اور بلند مضامین پیدا کرنے سے عاجز ہے۔''

(علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، سنہ 1950، ص24)

لیکن اسی مضمون میں ذرا آگے چل کر یہ وضاحت بھی کرتے ہیں: ''یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم صرف حسن خیال اور خیالات مفیدہ کے طرفدار ہیں، ہرگز نہیں۔ شاعری کالج یا مدرسہ کا سبق نہیں ہے۔ دنیا آنکھوں کے سامنے ہو۔...لطیف اور رنگین خیالات ہوں۔ طرز بیان دلکش ہو۔''

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبر منتخب سمجھیں
بیاں ایسا کہ دل مانے زباں ایسی کہ سب سمجھے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکبر کو فن کی خارجی ترکیب اور باطنی حسن کا گہرا شعور تھا۔ وہ مثبت فکر اور اعلیٰ مضامین کے قائل تھے اور خوب جانتے تھے کہ طریقۂ اظہار کو اثرانگیز، قابل قبول اور دلچسپ کیسے بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے شاعری کے شاہراہ عام سے الگ ہٹ کر ایک ایسی ڈگر اختیار کی جس پر اوروں کے لیے چلنا آسان ہو یا نہ ہو لیکن وہ اکبر کی شناخت اور ان کی انفرادیت کی گواہ بنی رہے۔ اس کا دعویٰ انھوں نے غزل کی شاعری میں کیا اور نظمیہ شاعری میں بھی۔ مثلاً یہ کہ:

غزل ایسی پڑھو مملو ہو جو عالی مضامیں سے
کرو اب دوسرے کوچے میں اے اکبر گزر اپنا
غزل ایسی پڑھوں جس سے برابر یہ صدا نکلے
عروجِ فکر عالی ہوں، نشانِ عشق کامل ہوں
کیوں کر نہ شعر اکبر آئے پسند سب کو
یہ رنگ ہی نیا ہے کوچہ ہی دوسرا ہے
سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں برفبار
شاہد معنیٰ نے اوڑھا ہے ظرافت کا لباس

تسلیم کیجیے کہ اکبر نے انگریزوں کے ہاتھوں بھارت ماتا کے لباس کو جس طرح تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا اور جو محسوس کیا تھا اسے انھوں نے ویسے ہی بیان کیا۔ واضح رہے کہ اکبر عورتوں کی تعلیم، ان کی آزادی اور نئی تہذیب کی مکمل تردید نہیں کر رہے تھے، بلکہ انھیں مشروط طریقے پر اپنانے کے حق میں تھے۔ اُس وقت ملک کا ایک بڑا طبقہ اِس نظریے کا حامی تھا اور یقین کیجیے کہ آج بھی ملک کا ایک بڑا طبقہ اس نظریے کا حامی ہے۔ اس نظریے کی حمایت یا مخالفت میں صحیح اور غلط کا مسئلہ تب بھی تھا، آج بھی ہے۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری میں کلاسیکی رنگ

اردو غزل کی روایت میں اکبرالہ آبادی کا نام ایک مزاح نگار یا طنز نگار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ عمومی رائے ہے کہ اکبر کی غزل میں شوخی و ظرافت کا رنگ ہے۔ ناقدین نے اکبر کی غزل میں بدلتے ہوئے زمانے اور تہذیب کے نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کی غزل میں بعض ایسے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو اس زمانے کے لیے نئے اور انوکھے تھے اور آج اتنا وقت گزرنے کے بعد ان الفاظ کی چمک اور تیزی میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ چند الفاظ کی اہمیت کم ہوجانے کی وجہ سے اکبر کے تمام شعری سرمائے کو ناقابل التفات قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اکبر کی شاعری کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس کا براہ راست رشتہ کلاسیکی اردو غزل سے قائم ہوتا ہے۔ اکبر کی غزل میں نیا شعری حسن ضرور نمایاں ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر انہوں نے کلاسیکی نظام شعر کی پیروی کی ہے۔ اکبر کی غزل میں صنعت ایہام کا استعمال کم نظر آتا ہے لیکن انہوں نے رعایتوں اور مناسبتوں کا فنی ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

کلاسیکی نظام شعرا کبر کی غزل میں معنی آفرینی کا عمل ہے۔ اکبر کی غزل میں عشق سب سے اہم موضوع ہے۔ اس کے علاوہ دنیا و ہستی کی بے ثباتی، ترک دنیا کی تعلیم، زندگی کی سختی و دشواری، دنیا کے بعد کی زندگی، موت کا ذکر اور خدا کے لازوال وجود کا اعتراف اکبر کی غزل کے موضوعات ہیں۔ اکبر کی غزل کا دستیاب مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق کے موضوع پر اپنا تمام تر زور صرف کیا ہے۔ اکبر آہ و نالہ اور گریہ وزاری کے مضامین کی طرف کم کم متوجہ ہوئے ہیں۔ ان کی غزل میں عشق کی گھلاوٹ کے بجائے معشوق کی بے التفاتی کا گلہ کرنے کی روش نظر آتی ہے۔ عشق کا اظہار، دل کی ربودگی، معشوق یا حسن کی تعریف، اس کا جور و جفا، اس کی دل عاشق سے بے اعتنائی، اس کا غیروں سے التفات کرنا اکبر کی غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ اکبر نے انہی موضوعات کو مختلف انداز سے سنوارنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں ہم کلاسیکی موضوعات کہتے ہیں۔ اس طور سے اکبر کی غزل میں زندگی کے گھنے اور گہرے تجربے کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اکبر کی غزل میں عشق زندگی کے ایک بڑے تجربے کے طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی غزل میں عشق کی شدت ضرور نمایاں ہوتی ہے لیکن انہوں نے عشق کے اظہار میں گھلاوٹ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ عشق کے موضوع پر اکبر کے غزل کے چند اشعار سماعت کیجیے:

زیادہ جان سے کیوں کر نہ رکھوں دل کو عزیز
یہ آئینہ تری صورت مجھے دکھاتا ہے

میں تو عشق بت ظالم سے نہ باز آؤں گا
عقل چھوٹ جائے جگر ٹکڑے ہو ایمان نہ رہے

میرا سوز دل آپ کیا دیکھتے ہیں
یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے

رکھنا پڑا ہے اس بت کافر سے میل جول
موقع نہیں ہے بحث حرام و حلال کا

پروفیسر ناصرہ سلطانہ، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی

رکھتا ہے قدم کوچہ گیسو میں جو بے خوف
کیا تو دل صد چاک ہے اے شانہ کسی کا

نگاہ شوق پر دست ہوس کو کیوں نہ رشک آئے
کہ یہ مجبور ہیں وہ کام کرتی ہے ادھر اپنا

ان اشعار میں عشق کی گھلاوٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ان میں اکبر کے طنزیہ مذاق کا بھی دخل ہے۔عاشق کا کردار معشوق کے سامنے سینہ سپر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔عاشق کی انا پسندی معشوق کے تئیں طنز اور شوخ لہجہ اختیار کر لیتی ہے۔دل کے آئینہ کا صورت معشوق دکھانا،عشق بت ظالم سے باز نہ آنا،آگ لگانے کا الزام معشوق کے سر ڈالنا،بت کافر سے میل جول کو مجبوری خیال کرنا،شانہء عاشق کا کوچہ گیسوئے معشوق میں قدم رکھنا اور دست ہوس کے بالمقابل نگاہ شوق کا معرکہء عشق سر کرنا میدان عشق میں طنز اور شوخی کا اظہار ہے۔اکبر کی غزل کی قرأت کے دوران یہ خیال ملحوظ رہے کہ اظہار عشق میں شوخی اور طنز کلاسیکی اردو غزل کا ایک اہم وصف ہے۔اکبر کی غزل میں کثرت کے ساتھ وہ مضامین ملتے ہیں ان میں شدت عشق نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر اکبر کا یہ شعر دیکھیے :

تمہیں ملو تو ملو ورنہ اور سے کیا کام
میں اپنے د ل کو کہیں اب لگا نہیں سکتا

اس شعر میں شدت عشق کا اظہار ہوا ہے۔شعر میں معشوق کو نہ بھول پانے کا احساس ہجر معشوق کا علمیہ بن گیا ہے۔اس شعر میں اکبر نے نہ تشبیہ سے کام لیا ہے اور نہ استعارہ سازی کی ہے۔ اظہار کی سادگی نے ہجر کے غم میں شدت پیدا کی ہے۔تمہیں ملو تو ملو کا فقرہ عشق کی شدت کا پتہ دیتا ہے۔اکبر کا ایک دوسرا شعر ہے:

روح تو ایک طرف ہوتی ہے رخصت تن سے
آرزو ایک طرف دل سے جدا ہوتی ہے

اس شعر میں روح،جسم،دل اور آرزو انسان کے وجود کا حصہ ہیں۔ ان کے بغیر انسانی وجود کا تصور ممکن نہیں۔انسان کی سانس جب تک باقی رہتی ہے دل کی آرزو بھی باقی رہتی ہے۔شعر میں روح کا جسم سے رخصت ہونا اور آرزو کا دل سے جدا ہونا ہجر معشوق میں شدت غم کا اظہار ہے۔گویا ہجر معشوق عاشق کے مکمل وجود کے انتشار کا سبب بن گیا ہے۔اکبر کی غزل میں لفظ آرزو محبت کی علامت کے طور پر آیا ہے۔ اکبر کا ایک دوسرا شعر ملاحظہ کریں:

زندہ جو تیرے ہجر میں ہوں میں تو کیا عجب
گو تو نہیں ہے پاس تیری آرزو تو ہے

اس شعر کی قرأت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق کو معشوق سے زیادہ اپنا جذبہء عشق سے سروکار ہے۔معشوق کے ہجر کا غم عاشق کے وجود کو کاہیدہ نہیں کرتا بلکہ معشوق کی یاد اور اس کا عشق عاشق کی زندگی کا سبب بن جاتا ہے۔ اکبر نے ایک دوسری جگہ معشوق کے تئیں اپنے شوق کا اظہار کیا ہے:

شوق پا بوسی جا نا مجھے باقی ہے ہنوز
گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے

اس شعر میں موت کے بعد بھی معشوق کی قدم بوسی کا شوق عاشق کے لازوال عشق کا اظہار ہے۔کلاسیکی اردو غزل میں معشوق کے تلوے حنائی کی رعایت سے رنگ گل،خون جگر اور خون دل کی تراکیب استعمال کی گئیں ہیں۔ لیکن تربت پر اگنے والی گھاس کا رشتہ معشوق کے پاؤں کی حنا سے قائم نہیں کیا گیا ہے۔عاشق کی تربت پہ حنائی گھاس کا اگنا موت کے بعد بھی دل کے لگاؤ کا باقی رہ جانا ہے میر نے کہا تھا:

ظاہر کو گو درست رکھا مر کے میں ولے
دل کا لگاؤ کوئی رہا ہے چھپا ہوا

میر کے اس شعر میں بھی موت کے بعد دل کے لگاؤ کا ذکر آیا ہے۔ میر نے یہاں معشوق کی پابوسی کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن اکبر اور میر دونوں کے اشعار میں موت کے بعد دل کے لگاؤ کا احساس مشترک پہلو ہے۔ میر کی غزل میں معشوق نے اپنے تلوے کو کئی موقعوں پر عاشق کے خون جگر سے رنگین کیا ہے۔ اکبر کے شعر میں عاشق کے خون جگر کا ذکر تو نہیں آیا ہے لیکن یہ بات بہت واضح ہے کہ یہ تربت کی گھاس کا رنگ بھی عاشق کے خون جگر سے حنائی ہوا ہے۔

اکبر نے اسلامی تہذیب اور معاشرے کا رشتہ بھی عشق سے قائم کیا ہے۔ اکبر کی غزل میں اس زمانے کی نئی زندگی کے مسائل ضرور نظر آتے ہیں لیکن اکبر نے تہذیبی اور مذہبی روایتوں سے کبھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا ہے۔ اکبر کی غزل میں مذہبی شعور کی تفہیم کے بغیر بات نہیں بنتی۔ پھر اکبر کی غزل مذہبی شعور اور اس عہد کے معاشرے کی تصویر کشی بھرپور نظر آتی ہے۔ اکبر کا شعر ہے:

سب کے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا
پھیلی ہمارے سوز محبت کی داستان
بتی پڑی جو شام سے گھر گھر چراغ میں

ان اشعار میں مذہبی شعور اور معاشرتی زندگی کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ اکبر کی غزل میں پردے کا مضمون بار بار آیا ہے۔ اکبر نے اپنی غزل میں نہ صرف خواتین کی نسبت سے پردے کا مضمون باندھا ہے بلکہ مرد کے لیے بھی پردے کو لازمی خیال کیا ہے۔ اس شعر میں بھی پردہ کرنے والا عاشق ہے نہ کہ معشوق۔ اکبر نے خانہ دل میں پردہ کرنے کے لیے وہم و خرد اور ہوش و تمیز کو باہر کیا ہے۔ یہی اوصاف دل میں خرابیاں بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی دل کی خرابی کا سبب بنتی ہے۔ گویا ان کی موجودگی میں دل پردہ دار نہیں ہوسکتا۔ ہمارے اسلامی معاشرے کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب خواتین کسی کے گھر تشریف لاتی ہیں تو پردے کے خیال سے گھر کے مرد کچھ وقت کے لیے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہم و خرد اور ہوش بھی مذکر الفاظ ہیں۔ اس طرح پردے کی رعایت سے وہم و خرد اور ہوش کا استعمال فنی ہنرمندی کا ثبوت ہے۔ اکبر کی غزل میں اسلامی معاشرے کی جس جگہ نمایاں ہوتی ہے۔ اکبر کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

بے تابیاں نصیب میں تھیں ورنہ ہم نشیں
یہ کیا ضرور تھا کہ انہیں پر نظر پڑے
طریق عشق میں مجھ کو کوئی کامل نہیں ملتا
گئے فرہاد و مجنوں اب کسی سے دل نہیں ملتا
ہیں اپنے داغ سینہ طعنہ زن خورشید محشر پر
تماشہ حشر کا ہے کوچہ چاک گریباں میں
امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانے ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر پہ درد سر اپنا

ان اشعار میں نصیب، کامل، داغ، سینہ، خورشید محشر، تماشہ حشر اور امانت جیسے الفاظ کا رشتہ مذہبی شعور سے قائم ہوتا ہے۔ نصیب یا تقدیر کے حوالے سے مذہب نے ہماری جس قدر رہنمائی کی ہے کوئی اور بنیاد داخلی سطح پر اس قدر ہمیں تقویت عطا نہیں کرتی۔ مرد کامل کا تعلق تصوف سے ہے۔ مرد کامل وہ شخص ہے جس کا دل دنیا سے اٹھ گیا ہو اور موت کے بعد کی زندگی ہر لمحہ اس کے سامنے ہو۔ طریق عشق کی ترکیب بھی تصوف سے متعلق ہے۔ داغ سینہ، خورشید محشر اور تماشہ حشر کا تعلق بھی مذہبی ذہن سے ہے۔ یہ تراکیب کلاسیکی غزل میں کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ اکبر نے اپنے داغ سینہ کی روشنی کو خورشید محشر پر فوقیت دی

ہے۔ اکبر کے اس شعر کے مقابلے میں شوق نیموی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

لایا یہ سیہ نامہ اعمال مرا رنگ
چمکے جو مرے داغ تو روپوش ہوئی دھوپ

دھوپ کی زمین میں ناسخ کی غزل بہت مشہور ہے۔ ناسخ نے بھی اس غزل میں خورشید قیامت کی ترکیب باندھی ہے۔ ناسخ کا شعر ہے:

ٹلتا ہی نہیں ہجر کا دن کیا ہے اڑی دھوپ
خورشید قیامت نے مرے گھر میں جڑی دھوپ

قیامت کے دن خورشید سوا نیزے پر ہوگا اس کی تپش نا قابل برداشت ہوگی۔ پھر قیامت کا دن بہت طویل بھی ہوگا۔ ناسخ نے قیامت کی ان رعایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مضمون باندھا ہے۔ شوق نیموی کے شعر میں متکلم کے داغ کی روشنی قیامت کی دھوپ کو مات دے رہی ہے۔ سینے کے داغ کا چمکنا اور سیاہ نامہ ءاعمال کا رنگ لانا بھی روز قیامت سے متعلق ہے۔ اب ان مضامین کی رعایت سے میر کا شعر ملاحظہ کریں:

خورشید کی محشر میں تپش ہوگی کہاں تک
کیا ساتھ مرے داغوں کے محشور ہوا ہے

میر کے شعر میں بھی روز قیامت کی رعایت سے خورشید، تپش، محشر، داغ اور محشور جیسے الفاظ آئے ہیں۔ میر نے اپنے شعر میں اکبر کی طرح طعنہ زن کی ترکیب تو استعمال نہیں کی ہے لیکن متکلم کے داغوں کی رعایت سے خورشید محشر کی تپش پر سوال قائم کیا ہے۔ میر کے شعر میں بھی خورشید محشر کی چمک متکلم کے داغوں کے سامنے مدھم نظر آتی ہے۔ روز قیامت میں اپنے داغوں کو خورشید محشر سے روشن قرار دینا کلاسیکی اردو غزل کا ایک اہم مضمون ہے۔ اکبر نے نہ صرف ان کلاسیکی مضامین اور تراکیب کو فنی ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا ہے بلکہ ان مضامین میں نئے معنی بھی خلق کیے ہیں۔ اور پرانے مضامین میں نئی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب اکبر کا شعر دیکھیے:

ہیں اپنے داغ سینہ طعنہ زن خورشید محشر پر
تماشہ حشر کا ہے کوچہ چاک گریباں میں

اکبر کے اس شعر میں دیکھیے کہ اول تو انہوں نے داغ سینہ، طعنہ زن، خورشید محشر اور کوچہ چاک گریباں جیسی کلاسیکی تراکیب استعمال کی ہیں۔ شعر کے معنی پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اکبر نے کوچہ چاک غریباں کی ترکیب داغ سینہ کی رعایت سے قائم کی ہے۔ سینہ کا داغ گریبان کے اندر پوشیدہ رہتا ہے۔ داغ سینہ کو گریبان کے اندر جھانکے بغیر دیکھنا محال ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اکبر نے چاک گریباں کی رعایت سے ہی کوچے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی گریباں کا چاک شدہ حصہ کوچے کی شکل اختیار کر گیا۔ اردو غزل میں چاک گریباں کی ترکیب تو بہت نظر آتی ہے لیکن کوچہ چاک گریباں کی ترکیب شاید اب تک کسی اور نے استعمال نہیں کی ہے۔ یہ ترکیب اکبر نے خلق کی ہے اور اس ترکیب سے نئے معنی بھی خلق ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ بالآخر داغ سینہ میں ایسی کیا بات ہے کہ حشر کا تماشہ بپا ہو گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہوگا کہ داغ سینہ کی جلن، تپش، سوزش، سیاہی اور خاص طور سے داغ سینہ کی چمک خورشید سے بھی زیادہ ہوگی۔ روز قیامت میں جس طرح خورشید چمکے گا اسی طرح سینے کے داغوں کی سیاہی بھی روشن ہوگی۔ اس طرح داغوں کی چمک، سوزش اور تپش وغیرہ سے حشر کا تماشہ بپا ہو جائے گا۔ داغ جگر کے ساتھ ساتھ اکبر نے اپنے اشکوں کا رشتہ بھی عشق حقیقی سے قائم کیا ہے۔

یہ عشق انفعال نہ خالی اثر سے ہوں
یا رب ہمارے موتیوں کی آبرو رہے

عشق انفعال کی ترکیب دیکھ کر ذہن اقبال کے شعر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اکبر نے اشک انفعال کے ساتھ ساتھ موتی کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ اس شعر میں آنسوؤں کا رشتہ معشوق حقیقی سے قائم ہوا ہے۔ اب میں اکبر کے چند اشعار آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تا کہ اکبر کے کلاسیکی طرز اظہار کے متعلق اندازہ کیا جا سکے۔

اک زمانہ کی ترے آگے جھکی ہے گردن
خم ابرو نہ ہوا کعبہ کی محراب ہوا
ہر چند دل سے یار کے جاتا نہیں غبار
رونے سے عاشقوں میں میری آبرو تو ہے
حباب آسا اٹھایا بحر ہستی میں جو سر اپنا
بنایا بس وہیں موج فنا نے ہمسفر اپنا

سینکڑوں دور جنوں ہیں ابھی آنے والے
مطمئن کیا ہیں مجھے ہوش میں لانے والے

کچھ ایسا بڑھ گیا ہے حسن لطف ساقی دوراں
ہزاروں شیشہ تقوی پڑے ہیں چار سو ٹوٹے

جو راہ ہے عشق میں دل پر مصیبت کوئی پڑتی ہے
خبر دینے کو فوراً آنسوؤں کا تار آتا ہے

کہاں تسکین خاطر نالہ جانکاہ کرنے سے
بھڑکتی آتش دل اور بھی ہے آہ کرنے سے

اشک خوں آلود آنکھوں میں نمایاں ہو گیا
دیکھیے دل بھی شریک چشم گریاں ہو گیا

غم ہے اتنا کہ دل زار پہ قابو بھی نہیں
ضبط یہ ہے کہ کہیں آنکھ میں آنسو بھی نہیں

تمہارے دل کی نزاکت پہ اس کو رم آیا
نہیں تو آہ میری ایسی بے اثر بھی نہ تھی

سینے سے تیرے متصل شاید اسے قرار ہو
گوندھ لے میرے دل کو بھی اپنے گلے کے ہار میں

دکھا کر آبرو ومژگاں نظر ان کی یہ کہتی ہے
کسی سے کیوں جھکیں ہم صاحب تیغ و سناں ہو کر

مجال گفتگو کس کو ہے ان کے حسن کے آگے
زبانیں بند کر دیں ان بتوں نے بے زباں ہو کر

اس توقع پر کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو
ماہ نو بھی چرخ پر شکل گریباں ہو گیا

نہیں روئے رنگیں پہ زلفوں کا جلوہ
گلستاں پہ بدلی یہ چھائی ہوئی ہے
دکھاتے نہ تھے آپ یوں مجھ کو آنکھیں
یہ شوخی کسی کی سکھائی ہوئی ہے

گونج سے بالے کی زلف الجھی میں عاشق ہو گیا
یہ نہ خوف آیا کہ وہ افعی ہے یہ زنبور ہے

خدا محفوظ رکھے الفت مژگان خوباں سے
یہ ذوق نشتر دل مرتے مرتے کم نہیں ہوتا

انہیں کی بے وفائی کا یہ ہے آٹھوں پہر صدمہ
وہی ہوتے جو قابو میں تو پھر کاہے کو غم ہوتا

اکبر کی غزل کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع اور طرز اظہار کی سطح پر اکبر کی غزل کا رشتہ کلاسیکی اردو غزل سے قائم ہے۔ ان کی غزل میں مضامین کی سطح پر تنوع اور معنی آفرینی کا عمل ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اکبر ایک مضمون کو مختلف انداز سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک ہی غزل میں ایک مضمون کو مختلف انداز سے باندھنے کا عمل معنی آفرینی ہی کی کوشش ہے۔ اکبر کی غزل میں عشق کے مضامین کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔انہوں نے معشوق کی بے اعتنائی اور بے توجہی کے مضمون پر خاصہ زور صرف کیا ہے۔معشوق کے حسن،اس کی چشم و ابرو،اس کے چہرے کی رنگت، گیسو، لب ورخسار، معشوق کی چال اس کی رفتار پر بھی کثرت کے ساتھ مضامین باندھے ہیں۔ متصوفانہ مضامین بھی اکبر کی غزل کا حصہ ہیں۔ اکبر نے زندگی کی بے ثباتی پر کثرت کے ساتھ مضامین باندھے ہیں۔اللہ کے وجود کا اعتراف، ترک دنیا کی تعلیم، موت کے بعد کی زندگی اکبر کی غزل میں نظر آتی ہے۔اکبر نے عمدہ اور خراب کے درمیان تمیز نہیں کی ہے۔ جس طرح کے مضامین ان کے ذہن میں آئے ہیں اسے اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔خاص طور سے ترک دنیا کی تعلیم اور موت کے بعد کی زندگی کے موضوع پر اکبر کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں جہاں اکبر کی طبیعت کی روانی اور ان کے خیال کی بلند پروازی کا

دخل کم ہے۔ عاشقانہ مضامین کے اظہار میں اکبر کی طبیعت کی روانی اور تخیل کی بلند پروازی مدھم ہوتی نظر نہیں آتی۔ معشوق کے حسن کے مرقعے خلق کرنے میں وہ فنی ہنرمندی سے کام لیتے ہیں۔ اکبر کی غزل کو جو چیز پرقوت بناتی ہے وہ ان کا طرز اظہار ہے۔ اٹھارویں صدی کی کلاسیکی اردو غزل کے مضامین اور لفظیات سے اکبر کی غزل پر ہے۔ دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ اکبر نے کس طرح ان مضامین اور لفظیات سے اپنا داخلی رشتہ قائم کیا ہے اور ان مضامین میں کیا نئی بات پیدا کی ہے۔

اکبرالہ آبادی کا تخلیقی انفراد

ہندوستانی زبان اور تہذیب ہند اور اس میں رہنے بسنے والوں کی تمام ذہنی و اخلاقی قدروں و تہذیبی کارناموں، سیاسی تحریکوں اور حکومتی کارروائیوں کی بھرپور عکاسی اکبرالہ آبادی کی شاعری میں ملتی ہے۔ اکبر کی شاعری آئینۂ زندگی ہے۔ ان کا کلام کہیں قلندرانہ، کہیں شاعرانہ، کہیں عام فہم، سادہ کہیں روایتیں اور کہیں حقیقت وجدت پسندانہ اور انقلابی ہے۔

اکبر روایتی ہوتے ہوئے بھی باغی تھے اور باغی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی، خاص و عام سب ان کو اپنا شاعر مانتے تھے۔ ان کا کلام دونوں طبقے کو حظ و انبساط سے ہم کنار کرتا ہے۔

''شمس الرحمٰن فاروقی کے مطابق میر تقی میر کے بعد اکبرالہٰ آبادی نے اپنے کلام میں اردو زبان کے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔''

اکبر کی شاعری کو محض مزاحیہ شاعری کے زمرے میں ڈالنا اکبر اور ان کی شاعری کے ساتھ زیادتی و ناانصافی ہے۔ غزل، قطعہ، رباعی اور نظم غرض شاعری کی اکثر صنف میں طبع آزمائی کی۔ مزید غزل میں انقلابی تجربے کیے ہیں۔ ان کی نظم شعری اور آزاد نظم میں بھی تنوع اور فنکاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ اکبر پہلے شاعر ہیں جنھوں نے زبان کے عام الفاظ اونٹ، گائے، شیخ، مرزا وغیرہ کا علامتی استعمال کیا اور اردو میں علامتی شاعری کی راہ ہموار کی۔ ان کے دور میں انگریزی اور ہندی کا اثر اردو پر بڑھ رہا تھا جس کے باعث انھوں نے اپنی شاعری میں انگریزی اور ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ ان کی شاعری کا اصل مقصد معاشرے کی اصلاح کرنا تھا۔ سماجی، تہذیبی اور سیاسی واقعات اور تجربات کو الفاظ کا روپ دیا اس کے لیے انھوں نے بامحاورہ الفاظ کا استعمال کیا۔

اکبرالہ آبادی اردو ادب کے ان منفرد شعراء میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو محض جذبات یا حسن و عشق کے جذبات تک محدود نہیں رکھا بلکہ طنز و مزاح، اصلاحِ معاشرہ اور جدید و قدیم اقدار کے سوارنے کو اپنا موضوع بنایا۔

سیّد اکبر حسین الہ آبادی ۱۶رنومبر ۱۸۴۶ء کو ضلع الہ آباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے۔ والد تفضّل حسین نائب تحصیلدار تھے۔ اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر ان کا داخلہ مشن اسکول میں کرایا گیا۔ لیکن گھر کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے ان کو اسکول چھوڑ کر پندرہ سال کی ہی عمر میں ملازمت تلاش کرنا پڑی۔ ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور عدالت کی کارروائیوں کو گہرائی کے ساتھ سمجھا۔ پھر ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر کے مصنف کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۰۵ء میں سیشن جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور باقی زندگی الہ آبادی میں گذار دی۔

اکبر کو اردو شاعری میں طنز و ظرافت کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اکبر کی ظرافت کا مقصد تفریح نہیں بلکہ اصلاح و تنقید تھا۔ اکبر کے طنز کا ہدف کوئی فرد خاص نہیں ہوتا۔ ہر شخص پہلی بار یہی سمجھتا ہے کہ طنز کسی اور کی طرف ہے لیکن غور کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ سبھی مخاطب ہیں اور جس کو ہم مذاق سمجھ رہے تھے اس کی تہہ میں تنقید و نصیحت ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہوں:

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

اکبر کی شاعری کا سب سے نمایاں، پہلو اصلاحی ہے، انھوں نے معاشرتی برائیوں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، تعلیم کے غلط رجحانات اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑی تنقید کی۔ ان کا مقصد قوم کو خواب غفلت سے جگانا اور اعتدال کی راہ دکھانا تھا۔

ان کی شاعری کے موضوعات میں مذہب، سیاست، معاشرت، تعلیم، عورت کا مقام اور وقت کے مسائل شامل ہیں وہ اپنی فکر میں نہایت بیدار اور صاحب بصیرت تھے۔ جنھوں نے اپنی قوم کو حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے۔

ان کی شاعری میں مشرقی روایات کی خوشبو بھی ہے اور وقت کے مسائل کی جھلک بھی۔ وہ اردو ادب میں ہمیشہ ''مصلح شاعر'' کے طور پر یاد کئے جائیں

پروفیسر بشریٰ بانو، شعبۂ اردو، مہیلا ودیالیہ ڈگری کالج لکھنؤ

گے۔

اکبر نے سرسیّد تحریک کو خاص طور پر اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ سرسیّد چونکہ جدت پسند تھے اور ملک وقوم کو مصلحتاً ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے تھے کہ لوگ انگریزی تہذیب کو اختیار کریں۔ لیکن اکبر اس تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔ وہ تہذیب و مذہبی عقائد میں تحریف کے قائل نہ تھے۔ ان کو مشرقی تہذیب اور ہندوستانی روایت سے عشق تھا۔

اسی طرح عورتوں کی تعلیم اور آزادی کا مسئلہ بھی اٹھا۔ اکبر نے اس کی بھی شدید مخالفت کی وہ اس تبدیلی کو قوم کے حق میں مضر خیال کرتے تھے۔ اکبر نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے ملک کی عورتیں بے پردہ رہیں تعلیم حاصل کرنے کی دوڑ میں اپنی تہذیب کو طاق پر رکھ دیں اور آزادی سے کالجوں اور پارٹیوں میں شرکت کریں۔ اسی سلسلے میں مثال کے طور پر شعر ملاحظہ ہوں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر کی شاعری فکر وفن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اکبر کا تعلق چونکہ کلاسیکی شاعری سے تھا۔ لہٰذا انھوں نے اس کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ اور اپنی شاعری کو ایک نیا رخ دیا۔ انہیں انفرادیت کے باعث آپ کی شخصیت شاعری کے میدان میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گی۔

اکبرالہ آبادی اردو شاعری کی دنیا کا وہ نام ہے جسے پڑھتے ہی قاری کے لبوں پر مسکراہٹ آتی ہے اور دماغ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے زندگی کے بڑے سے بڑے مسئلے کو ہنسی مذاق اور طنز کے ذریعے پیش کیا۔

اگر شاعری کو ایک آئینہ مانا جائے تو اکبرالہ آبادی ایسے شاعر ہو گئے جن کے آئینے میں نہ صرف چہرا بلکہ زمانے کے سارے تضادات صاف نظر آتے ہیں۔ وہ ہنساتے بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ ان کے اشعار پڑھ کر لگتا ہے ہے جیسے کوئی دوست مذاق میں سچائی بتا رہا ہو۔

اکبر کا اصلی نام سیّد حسین تھا، مگر دنیا نے انہیں اکبرالہ آبادی کے نام سے جانا۔ وہ ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے اور اس دور میں جب انگریزوں کا دور بڑھا چھڑا ہوا تھا۔ اس دور میں اکبر نے قلم کو ہتھیار بنایا اور معاشرے کو یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ ترقی ضرور کرو، مگر اپنی پہچان کھو کر نہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری پڑھ کر لگتا ہے جیسے کوئی دوست ہنسی ہنسی میں وہ تلخ حقیقت بتا دے جس پر ہم عام ذہنوں کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ ان کے کلام میں طنز بھی ہے مزاح بھی اور سب سے بڑھ کر سوچنے پر مجبور کرنے والی صلاحیت بھی۔

مثال کے طور پر نظم ''اک سیمیں بدن'' کو دیکھ لیں۔ شاعر یہاں ایک حسین مغربی خاتون کا ذکر کرتے ہیں جو لندن سے آئی ہے۔ تمام لوگ اس کے حسن پر فدا ہیں۔ لیکن اکبر ہنساتے ہنساتے قوم کی کمزوری دکھا دیتے ہیں۔

قوم اکٹھے ہوئے سیکڑوں وضعدار
سب پہ اک سیم بدن کے جلوے کا اثر

یہاں اکبر نے مزاحیہ انداز میں بتایا کہ کس طرح پوری قوم مغربی فیشن اور جسمانی حسن کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہے۔ بظاہر تو یہ ہنسانے والی بات ہے، مگر اندر سے یہ سوال بھی جگاتا ہے کہ ہماری پہچان صرف دوسروں کی نقل کرنے میں رہ گئی ہے۔

اکبرالہ آبادی نے اردو شاعری میں طنز ومزاح کو محض ہنسی مذاق کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اسے ایک سنجیدہ سماجی اور تہذیبی تنقید کا ہتھیار بنایا۔ وہ ایسے دور میں لکھ رہے تھے جب ہندوستانی معاشرہ مغربی تہذیب کی زد میں تھا۔ اکبر نے اپنی شاعری میں مغربی انداز زندگی کی اندھی تقلید کو نمایاں کیا اور دکھایا کہ یہ رویہ کس طرح مشرقی اقدار کو کھوکھلا کرتا ہے۔ ان کے طنز صرف مذاق نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک گہرا پیغام تھا، جس کے ذریعے وہ عوام کو جھنجھوڑنا چاہتے تھے۔

اکبر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے پیچیدہ سماجی مسائل کو اس طرح بیان کیا کہ وہ انتہائی دلچسپ اور عام فہم ہو گئے۔ان کے شعر میں مزاح بھی ہے اور سوچنے پر مجبور کرنے والی صلاحیت بھی۔مثلاً وہ اس طبقے پر سخت طنز کرتے تھے جو انگریزی تعلیم کو صرف ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔یا جو مذہبی اور اخلاقی اقدار کو پسِ پشت ڈال کر محض مغربی انداز اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔اس طرح اکبرالہ آبادی نے طنز مزاح کو اصلاحِ معاشرہ کا ایک طاقتور ذریعہ بنا دیا۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری محض اپنے دور کی عکاس نہیں بلکہ آج کے حالات پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔انھوں نے جس اندھی مغربی نقالی پر طنز کیا تھا، وہ رویہ آج بھی ہمارے معاشرے میں مختلف شکلوں میں موجود ہے۔گلوبائزیشن کے اس دور میں جب نوجوان طبقہ مغربی طرزِ زندگی اور فیشن کو اپنانے میں سبقت لے جانا چاہتا ہے، اکبر کے اشعار ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ ترقی کا مطلب اپنی تہذیبی اور اخلاقی شناخت کھو دینا نہیں ہے۔

آج کہ دنیا میں اکبرالہ آبادی کی عکس ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ جدیدیت اور ٹیکنالوجی کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اپنی روایت اور اقدار کو کیسے محفوظ رکھا جائے۔ان کا طنز آج بھی ہمیں آئینہ دکھاتا ہے کہ کہیں ہم سہولتوں اور دکھاوے کی دوڑ میں اپنی سچائی اور سماجی ذمہ داریوں سے غافل تو نہیں ہو رہے۔ اس لیے اکبرالہ آبادی کو محض ایک تاریخی شاعر نہیں بلکہ ایک ہم عصر رہنما کے طور پر پڑھا جانا چاہیئے۔

اکبرالہ آبادی کی فطرت میں خود انکساری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔دنیا کی بے ثباتی کی کتنی عمدہ مثال مندرجہ ذیل اشعار میں موجود ہے۔

ہر خاک کے پتلے کو ابھارا ہے فلک سے
یکتائی کے اظہار میں مست اہلِ زمیں ہے
ہر اک کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم بھی ہیں کوئی چیز
اور ہم کو ہے یہ ناز کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں

اکبر صاحب نئی تعلیم و انگریزیت کے سخت مخالف تھے۔گو کہ عوام الناس کو وہ نئی تعلیم سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس کی تڑک بھڑک سے خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔

یہ پوچھا شیخ سے میں نے کہ کہیے کیا گزرتی ہے
یہ سن انیس سو دس ہیں نئے مقصود منظر ہیں
نہایت یاس و حسرت سے وہ بولے کیا کہوں تم سے
یہ دو مصرعے سنو جن میں نہاں دفتر کے دفتر ہیں
نئی تعلیم کے مردے تو زندہ ہیں تماشوں میں
پرانی وضع کے زندے مگر مردوں سے بدتر ہیں

مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

طفل دل کو الفتِ زلفِ بتاں اک کھیل ہے
خیر ہو ایماں کی یارب کافروں سے میل ہے
مغربی چکر میں تفریحیں بھی ہیں ایذا کے ساتھ
امتیاز اس کا ہے مشکل پارک ہے یا جیل ہے
برکتیں ساکت، سعادت دم بخود، مذہب خموش
دل دعا سے بے خبر تدبیر ہی سے میل ہے

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجواں
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے

قومی شاعری کا تصور بھی اکبر کے یہاں موجود ہے:

لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی
خوب کھلی ہے برج میں ہولی
رنگ میں ڈوبی ہے سب کی چولی
سب نے زباں پہ گیت پہ کھولی

اکبرالہ آبادی کو یہ بہت شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ قوم وملت اور سماج وبقا معاشرہ کی بقا دین ومذہب ہی میں ہے:

کیوں رنگ حق پوش میں آؤ
غیرت پکڑو جوش میں آؤ
مذہب کے آغوش میں آؤ
غافل بندو ہوش میں آؤ

اور وہ اپنے اسی مشورے کا پختہ ترین اظہار بھی کرتے ہیں:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے
دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا ہمیں

آخرت اور دینِ حق کے پیروکار اور وحدت وتوحید کے علم بردار کے حیثیت سے بھی اکبر کی شاعری پروقار انداز میں نظر آتی ہے۔

خالق کی توحید سکھاؤ
عقبیٰ کی، تمہید سکھاؤ
ملحد کی تردید سکھاؤ
روحانی اُمید سکھاؤ

پردے کی افادیت، انفرادیت اور اہمیت مسلم ہے۔قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے۔اکبرالہ آبادی بھی اس اہم گوشے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اس کی تائید کی کتنی عمدہ مثال پیش کی ہے:

جب تک ہم میں ہے مصلحت باقی
بے شک پردے کی ہے ضرورت باقی
چالیس برس تک کی ہے شاید
بعد اس کے رہے گی نہ حجت باقی

قوم کی بدحالی وبدفعالی کا تصور اکبرالہ آبادی کو پریشان کئے ہوئے تھیا۔وہ نتیجہ ہائے غم سے بہت افسردہ تھے لکھتے ہیں:

جو حسرت دل ہے وہ نکلنے کی نہیں
جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں

یہ بھی ہے بہت کہ دل سنبھالے رہے
قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

لکھنؤ کے گردو اطراف میں آم کے مخصوص باغات اور ان کا دلفریب ذائقہ جس کی شہرت بہت دور دراز تک پھیلی ہوئی ہے۔ اکبر الہ آبادی ایک خط بنام منشی نثار حسین لکھنؤ میں رقم طراز ہیں:

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے
اس فصل میں جو بھیجے بس آم بھیجئے
ایسے ضرور ہوں کہ اُنہیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

خودستائش اور خودی کا عنصر بھی اکبر کی شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

پہلے تھا قوم میں سب کچھ مگر اب کچھ بھی نہ رہا
کسی شاعر نے ہے واللہ یہ خوب کہا
سچ کے پاس ہے اب صرف مصلیٰ باقی
اور مرے پاس ہے اردوئے معلیٰ باقی

ایک اور مثال پیش ہے:

واں شوکت و زینت کے جو اسباب بہت ہیں
معنی کے یہاں گوہر نایاب بہت ہیں
صاحب کی سی محفل تو میسر نہیں لیکن
صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

انگریزی الفاظ واصطلاح کی آمیزش بھی اکبر کی شاعری میں حد درجہ موجود ہے۔ جو شاعری کے حسن میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ مثال:

کیا کہوں اس کو میں بدبختیِ نیشن کے سوا(Nation)
اس کو آتا نہیں اب کچھ امی ٹیشن کے سوا(Imitation)

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو(Relation)
اس کو کالج اور اسے کانوکیشن کے سوا(Cnovocation)
ہو جنھیں مقدرت وضع ونفاذِ قانون
بس انہیں کو صفِ اقوام میں نیشن سمجھو(Nation)

آہ فریاد سے قابو میں نہ آئے وہ یار
تپشِ قلب کو بنگال اجی ٹیشن سمجھو(Agitation)

اسمال نہیں گریٹ ہونا اچھا (Small) (Great)
دل ہونا برا ہے پیٹ ہونا اچھا

پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار
انسان کو گریجویٹ ہونا اچھا(Graduate)

سوپ کا شائق ہوں یخنی ہوگی کیا(Soup)
چاہئے کٹلٹ یہ قیما کیا کروں(Cutlet)

اجل آئی اکبر، گیا وقت بحث
اب اِف کیجے اور نہ بٹ کیجے(If) (But)

علی گڑھ تحریک کے روح رواں اور قوم ومعاشرہ کو پسماندی کے دلدل سے نکالنے والے سرسیّد احمد کے وہ (اکبرالہ آبادی) مخالف نہیں تھے۔اگر یہ کہا جائے کہ سرسیّد اور ان کا مشن ایک ہی تھا تو غلط نہ ہوگا۔اصلاحِ قوم کا نظریہ دونوں کا جداگانہ تھا مگر مقصد ایک ہی تھا۔سرسیّد احمد خاں کی حمایت میں چند نمونے عرض ہیں:

سر سیّد کا جو عہد مشن تھا
اس سکے کا ٹھیک چلن تھا
حسب ضرورت طرز سخن تھا
وقت وہ اور تھا اور ہی سن تھا
حاضر ہوا میں خدمت سیّد میں ایک رات
افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

غرض یہ کہ سیّد اکبر حسین اکبرالہ آبادی کا اردو کے شعری ادب سے وابستگی بالکل فطری تھا۔طنزیہ مزاحیہ شاعری شوخیِ وظرافت،اور قوم ومعاشرہ کی اصلاح کا تصور اکبر کے بغیر نامکمل ہے۔جب اکبرالہ آبادی کی تخلیقی انفراد کا ذکر آتا ہے تو دراصل اس سے مراد اکبر کی اصلاحانہ شاعری ہے جو طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کے پیکر میں ڈھلی ہوتی ہے۔

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں
افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

ہے ملک ادھر تو قحط زدہ اس طرح یہ وعظ
کشتے وہ کھا کے پیٹ بھرے پان سیر میں
چھوٹا اگر میں گردش تسبیح سے تو کیا
اب پڑ گیا ہوں آپ کی باتوں کے پھیر میں

ایک دوسری مثال:

منی کو بھلا دیتی ہے صورت ہے تو یہ ہے
نیچر بھی سبق سیکھ لے زینت ہے تو یہ ہے

مشرقی تہذیب وبقا کے لئے اکبر صاحب اس قدر پریشان وپشیمان تھے کہ:

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

دراصل اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب وتمدن کے منکر نہیں تھے بلکہ جن حالات سے وہ دوچار ہورہے تھے جس ذہنی کرب کے وہ شکار تھے، ان کی دور رس نگاہیں قوم کی پسماندگی کا جو احاطہ کررہی تھیں اور نئی نسل کا میلان جس جانب ہورہا تھا وہ ان کے لئے فکروتردد کا باعث بنتا جارہا تھا۔

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی
وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا، کہیں روپ کی کیا ہمیں نہ رہے

اکبرالہ آبادی تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ جولڑکی تعلیمی زیورات سے مزین نہ ہو اس کا قصوروار وہ اس کی والدین کو قرار دیتے ہیں۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حسن معاشرت میں برابر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے

دراصل اکبرالہ آبادی کا شعری سرمایہ تخلیقی اثرانگریزی، زبان وبیان کی نیرنگی، الفاظ کی دلاویزی اور بےشمار احساسات وتصورات کا دلکش نمونہ ہے۔

اردو شاعری کی دنیا میں اکبرالہ آبادی کی انفرادیت اوران کا مقام ومرتبہ

اکبرحسین رضوی، اکبرالہ آبادی کا نام آتے ہی سب سے پہلے ہمارے ذہنوں میں وہی غلط اور مکروہ منظر اور تصور ابھرتا ہے جس میں ایک شخص کرسیء عدالت پر بیٹھ کر یا سرکارانگلشیہ بہادر کی ملازمت کرتے ہوئے بھی قدیم اقدار کا دلدادہ ہے، جدیدیت اور نئے پن سے بالکل نابلد ہے یا رہنا چاہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا دشمن ہے جو قوم کا بھلا اور انہیں نئی روشنی سے واقف کرانا چاہتے ہیں یا اس جانب کھینچ کرلاتے ہیں۔ وہ ایسے شریف، ہمدردان قوم اور نیک طینت لوگوں کی مخالفت دشمنوں سے بھی زیادہ شد و مد سے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم، انگریزی تہذیب، قوم انگریز، لندن، کلب، پائپ وغیرہ سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین اور سخت ہدایات کرتا ہے۔ نیز جو موقع وحالات شناس افراد، بہ نیت مصلحت وحکمت، ان سب چیزوں کو ہندوستانی اقوام کو اپنانے اور اختیار کرنے کی عادتیں ڈال رہے ہیں، قوم پر آئی نکبت ومصیبت سے نجات کا حل ان کی تابعداری اور روش کے اختیار میں کرنے میں سمجھ رہے ہیں، یوں وہ مصلحین قوم یا ریفارمر بن گئے ہیں۔ انہی نجات دہندگان اور قوم کی کشتی کو طوفانوں سے سلامت نکالنے والوں کو وہی شخص، کڑے لفظوں میں سخت و سست، انگریزوں کا غلام، ان کی تہذیب سے متاثر ومرعوب اوران کے کلچر کو ہندوستانی ومشرقی کلچر پر فوقیت دینے والا کہہ کر ان کا تمسخر اڑا رہا ہے اور انہیں غیر فطری نام دے کر ان پر طرح طرح کی بہتان تراشیاں کررہا ہے۔ نیز انہیں ہدف تنقید بناتے ہوئے ان پر بے رحم تنقیدیں بھی کررہا ہے۔ اسی طرح وہ جدیدیت اور تبدیلی کا بھی سخت مخالف ہے جو کہ ہر قوم اور ملت کا بنیادی عنصر ہوتا ہے اور ایسا طریقہ، جو صدیوں سے رائج ہے۔ وغیرہ- مزید یہ تاثرات اس شخص کے تئیں، مقابل تحاریر وتقاریر اور غلط پروپیگنڈوں سے بھی مضبوط ہوتے جاتے ہیں مگر جب ان غلط فہمیوں اور مغالطوں کی چادریں ذہن سے ہٹتی جاتی ہیں اور جب ہم سچائی کا آئینہ لے کر اس حقیقت کی دریافت کرتے ہیں تو اس شخص کی فکر صحیح، نگاہ دوربین، اس کی آگہی ومعاملہ فہمی تک رسائی کے در وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ شخص قوم کا سچا ساتھی اور ہمدرد نظر آتا ہے اوران اداروں کا حامی بھی، جو اصلاح قوم اور انگریزوں کے مشن کے پیامبر تھے۔ نیز ان کے متعلق ماقبل میں کہی گئی سب باتیں جھوٹ اور غلط پروپیگنڈہ ثابت ہوتی ہیں_ ان کے خلاف سازش لگتی ہیں یا ایک خاص ذہن کی پیداوار جن کا حقیقت سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ نیز جب ہم ان کا مزید گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اس طرح کے قومی ناصح اور ہمدرد کے روپ میں نظر آتے ہیں:

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے
لطف کیا جو لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا
روکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

شاعری واردات قلبی اور زندگی کے نت نئے تجربوں کا شاعرانہ بیان ہے شاعر کو اپنے خیالات اور احساسات کو دوسروں تک منتقل کرنے کا جذبہ شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اچھا شعر وہ ہے جو صرف اپنے خالق کے جذبات ومحسوسات کی عکاسی ہی نہ کرے بلکہ قاری اسے پڑھ کر یہ محسوس کرے کہ یہ اس کے اپنے جذبات واحساسات ہیں اس سے وہ حظ اٹھائے، اس کے جذبات کو تسکین ہو۔

شاعری کوئی اضطراری عمل نہیں ہے اس میں انسانی شعور کو دخل ہے اسی لیے جذبات وخیالات اور تجربات کے بیان کے لیے کچھ ضابطے ہیں جن کی پابندی ہر شاعر کو کرنی پڑتی ہے۔ وہ ضابطے مجرد احساسات ومحسوسات کو ہیئت دیتے ہیں، اس کو صوری خوبیوں سے مزین کرتے ہیں۔ شعر میں خوبصورتی معنی اور صورت کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے شاعری کے لیے تخیل کے ساتھ فن شاعری سے بھی آگاہی ضروری ہے۔ زبان پر قدرت ہونا بھی لازمی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

بہترین صاحب فن وہ ہے جو معنی وصورت میں بہترین طریقے پر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے تو اس وقت صورت ومعنی اس طرح

ڈاکٹر الیاس عزیز ندوی، موضع کرتھی ڈیہہ، ضلع سدھارتھ نگر یوپی

آپس میں پیوست ہو جاتے ہیں کہ یہ بتانا سخت مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا حصہ معنی کا ہے اور کون صورت کا۔''(۱)

اور جو تھوڑا بہت فرق نظر بھی آتا ہے تو بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

"محض صوری ہے اصلی نہیں۔''(۲)

خیال کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو اگر اس کو بیان کرنے کے لیے صحیح فارم، موضوع الفاظ، مناسب انداز بیان اختیار نہ کیا جائے تو وہ کوئی اثر قاری کے ذہن میں نہیں چھوڑے گا اس لیے جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ شاعر نے کیا کہا ہے "اتنی اس کی بھی ہے کہ'' کیسے کہا ہے۔'' اصل میں:

''جو رشتہ لفظ کا معنی سے ہے وہی مواد کا ہیت سے ہے۔ یہ ایک دوسرے کا تکملہ ہے اس کو اس کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا ہے۔''(۳)

اس لیے کسی شاعر کے مطالعے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی شاعری کے دونوں پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر اس پر بحث کی جائے۔ عام طور پر فنکار اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اپنے پیش روؤں کی چھوڑی ہوئی روایات سے کرتا ہے اور تجربے اور مشق کے بعد جب اس کے فن میں بلوغت آتی ہے تو اس کے فن میں انفرادیت آتی ہے اور اس کے لیے اسے نئے سانچوں اور نئے اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی شاعر کے کلام کا کماحقہ مطالعہ اس عہد کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کے پس منظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری کے معاملے میں یہ چیز اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ وہ طنز نگار شاعر ہیں اور طنز نگار کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے اور اپنے ماحول پر گہری نظر ڈالتا ہے اور اس کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو اپنے طرز کا نشانہ بناتا ہے۔ اکبر نے اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کی جیسی ہمہ گیر اور ہمہ جہت تصویر طنز و مزاح کے موئے قلم سے کھینچی وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اردو میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

حالی اکبر اور اقبال اردو کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم و ملت کو راہ ہدایت دکھائی۔ ذہنی استعداد، بصیرت اور تخلیقیت کی بنا پر ان تینوں کی شاعری کا نقطہ نظر اور رنگ و آہنگ الگ الگ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ تینوں نے ملک کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور فن کے تقاضوں کا احترام کرتے ہوئے تینوں کا مطمع نظر معاشرے کی اصلاح اور فلاح تھا۔

اکبر کے یہاں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہے اس لیے عام طور پر ان کی شاعری کو محض خوش طبعی اور خوش وقتی سمجھ لیا گیا اور اس کی ادبی اور سماجی حیثیت کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی یہ مستحق ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکبر کی آواز اپنے عہد کی آوازوں سے مختلف بلکہ مخالف تھی۔ اس وقت جب کہ مصلحین قوم کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ اسی ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کر کے ترقی کی راہ پر قدم بڑھانا چاہیے یا مغربی تعلیم حاصل کر کے مغربی طرز فکر کو اپنانا چاہیے، تو اکبر ان لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے، جو مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کر رہے تھے اور مغربی طرز فکر اور مغربی طرز معاشرت کو اپنا رہے تھے، اس وقت جب اس پر زور دیا جا رہا تھا کہ زمانے کی ہوا کا رخ پہچان کر اسی سمت چلنا چاہیے، اکبر ماضی کی یاد دلاتے اور اس سے رشتہ استوار رکھنے پر اصرار کرتے تھے۔ اس لیے عام طور پر وہ رجعت پسند اور قدامت پرست سمجھے جانے لگے اور ان کے بارے میں دو رائیں ہوگئیں ایک تو یہ کہ وہ محض ہنستے اور ہنساتے ہیں یا الفاظ کے الٹ پھیر سے مزاح دوسری یہ کہ ~~پیدا کرتے~~ ~~تعصب رکھتے ہیں~~ کٹر مذہبی، تنگ نظر اور لکیر کے فقیر ہیں۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں رہی جنہوں نے اکبر کی خدا پرستی اور ماضی پسندی کے جذبے کو حد سے زیادہ سراہا اور اس طرح ان کے شاعرانہ منصب کی غلط تعبیر کی۔ غرض اکبر کی شاعری کو کچھ تو تعصبات نے اور کچھ بیجا عقیدت نے دھندلا دیا۔

اکبر نے اپنی شاعری کی ابتدا روایتی غزل گوئی سے کی۔ انہوں نے غزل کے مخصوص مضامین کو اس کی روایتی زبان میں تشبیہوں، استعاروں تلمیحوں اور ترکیبوں میں بیان کرنا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی ان کی زبان کی صفائی، گھلاوٹ اور مکالماتی انداز ہے جس میں بلا کی برجستگی ہے۔

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو آتا کیا ہے

اردو شاعری میں اکبر کے مقام کے تعین میں ابھی تک انصاف سے کام نہیں لیا گیا اور ان کی شاعری کی اہمیت کو بھی پوری طرح سے نہیں سمجھا گیا اس کی ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ طنزیہ و مزاحیہ ادب دوسرے درجہ کا ادب ہے۔ اس کا مقصد صرف چٹکلے بازی سے لوگوں کا دل خوش کرنا یا طعن و اعتراض سے دل کی بھڑاس نکالنا ہے۔ اس سے کسی سنجیدہ مقصد اور با معنی طرز فکر کی توقع نہیں کی جاتی ہے۔ یہ سوچنے میں ہم ایک حد تک حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ہمارے یہاں طنز و مزاح کی روایت مجموعی طور پر کچھ رفیع اور وقیع نہیں ہے۔ پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح میں مثبت پہلو سطح ظاہر پر نہیں ہوتے بلکہ منفی پہلو بظاہر نمایاں معلوم ہوتے ہیں اس سے بھی یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ طنز و مزاح کے غرض و غایت تخریب ہے، تعمیر نہیں ہے۔

دراصل طنز و مزاح کی اہمیت سنجیدہ ادب سے کم نہیں ہونی چاہیے ادب کا تعلق انسانی زندگی سے ہے اور انسانی زندگی مجموعی طور پر دکھوں، مجبوریوں، پریشانیوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی چاشنی لطف و شیرینی پیدا کرتی ہے۔ یہ زندگی کے سفر کی دشواریوں کو آسان بناتی ہے اس کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے۔

ہنسنا ہنسانا انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ یہ بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس پر اور کیوں ہنسا جا رہا ہے۔ ہنسی فرد یا فرقہ یا جماعت کی دل آزاری کا سبب بھی بن سکتی ہے اور فرحت و انبساط کا بھی، اسی طرح طنز کا نتیجہ عیب جوئی اور طعن و اعتراض بھی ہو سکتا ہے اور اگر اس کا رخ سواد کی بے ڈھنگی حرکتوں، غیر معتدل رویوں کی طرف ہو تو وہ سماج کی اصلاح کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے اس لیے کہ:

''اکثر مزاح ایسے ہوتے ہیں کہ بحث و منطق کے کڑوے گھونٹ قبول نہیں کر سکتے لیکن ظرافت کی چاشنی سے راہ راست پر آ جاتے ہیں۔'' (۴)

اسی طرح اگر طنز سماج کے ریاکار، مفاد پرست، گندم نما جو فروش حضرات کی قلعی کھولتا ہے اس وقت بھی اس کا مقصد تخریب نہیں تعمیر ہوتا ہے۔

''اگرچہ اس ہنسی کی بنیاد تضحیک و تذلیل پر قائم ہوئی ہے لیکن تدریجی نشو و نما کے بعد ہنسنا اصلاح و تربیت کا ذریعہ بن گیا۔'' (۵)

''زندگی کو کرخت سنجیدگی سے انسان کو بچانے اور شکست خواب سے پیدا ہونے والے ناقابل برداشت صدموں کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کے علاوہ احساس مزاح کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کا وجود سوسائٹی کو مستحکم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔'' (۶)

یہی نہیں بلکہ:

''اس کی بدولت سوسائٹی ان تمام بیرونی لیکن مضر اثرات سے محفوظ رہتی ہے جن کو یہ نشانۂ تمسخر بناتا ہے۔'' (۷)

ادب انسانی زندگی کا ترجمان ہے اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں ہنسی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ آنسوؤں کی زندگی میں دکھ سکھ کے راستے مساوی چلتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہر چیز کے کچھ روشن کچھ تاریک پہلو ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ طنز و مزاح کے ساتھ بھی ہے۔ اصل میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اگر کسی طنز و مزاح نگار کے یہاں طنز و مزاح کے منفی پہلو زیادہ ہیں اور مثبت کم ہیں تو وہ ایک اچھا طنز نگار کہلانے کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر کسی مزاح نگار کے یہاں مثبت پہلو زیادہ ہیں اور منفی کم تو وہ اچھا طنز و مزاح نگار ہے اس کی اور اس کے فن کی اہمیت مسلم ہے پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ:

''موضوع سنجیدہ ہو یا غیر سنجیدہ، بوجھل ہو یا ہلکا، دشوار ہو یا آسان، پیچیدہ ہو یا سیدھا سادہ، غرض ہر قسم کا موضوع خام مواد ہے۔،، (۸)

اور فنکار کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو کوئی شکل دے۔ اس میں حسن اور معنویت پیدا کرے اور قطع نظر اس کے کہ وہ سنجیدہ ادیب اور شاعر ہے یا مزاحیہ اور طنزیہ وہ اپنی فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس کو ایک اچھا فن پارہ بنا دیتا ہے۔ ہر تخلیقی فنکار ان سب منازل سے گزرتا ہے یعنی زندگی کا مشاہدہ کر کے وہ زندگی کے مسائل کا تحلیل و تجزیہ کرتا ہے اور اس کو اپنے نقط نظر اور اسلوب میں پیش کرتا ہے۔ اس لیے:

''ظرافت نگار محض کسی بے آہنگی کا مضحکہ خیز بیان نہیں کرتا بلکہ وہ اس بے آہنگی کی تخلیق بار دگر کرتا ہے۔'' (۹)

غرضیکہ ظرافت نگار اور طنز نگار اپنے تخلیقی سفر میں وہی منزلیں طے کرتا ہے جو دوسرے تخلیقی فنکار کو طے کرنا پڑتی ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ

اس کی اہمیت کم ہو یہی نہیں بلکہ اگر ہم دیکھیں تو ظرافت نگار اور طنز نگار کا کام ایک طرح سے زیادہ ہی مشکل ہے کیونکہ اس کا کام فرد یا سماج پر تنقید کرنا ہوتا ہے اور اس میں اگر ذرا سی بھی بد احتیاطی ہو جائے تو اس کا مزاح بے لطف اور طنز کا وار بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ:

''کسی زبان میں مزاح اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک زبان ترقی کر کے اپنے کمال کی سرحدوں کو چھونے کے قریب نہ پہنچ گئی ہو اور اہل زبان فہم و فراست شعور و ادراک کے ایک خاص نقطہ پر نہ آ گئے ہوں۔'' (۱۰)

اس کا یہ مطلب ہے کہ طنز و مزاح کے لیے زبان پر قدرت کے ساتھ فہم و فراست، شعور و ادراک کی بھی ضرورت ہے تو پھر ہم کس طرح طنزیہ اور مزاحیہ ادب کو دوسرے درجے کا ادب کہہ سکتے ہیں۔ اگر فنکار مزاحیہ موضوع کو سنجیدہ مقصد کے لیے پیش کرتا ہے اور قاری ہنسنے ہنسانے کے ساتھ ساتھ اس پر غور و فکر بھی کرتا ہے تو وہ اتنا ہی اہم اور وقیع ہے جیسا کہ کوئی بھی ادب پارہ موضوع سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہوسکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ طنز و مزاح کی یہ بھی ایک افادیت ہے کہ اس پیرائے میں وہ سب افسانے بیان ہو جاتے ہیں جن کے ناگوار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مزاح نگار ان کو اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ وہ ناگوار نہیں ہوتے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کو آپ سنجیدہ پیرائے میں بیان کریں تو وہ افراد کی گرفت میں کیا قانون کی گرفت میں بھی آ سکتی ہیں لیکن ان کو آپ اگر مزاحیہ پیرائے میں کہہ جائیں تو آپ کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔ طنزیہ و مزاحیہ ادیبوں کے ایسے بے شمار شعر اور فقرے گنائے جا سکتے ہیں جن میں افراد مختلف سماجی مذہبی اور سیاسی اداروں پر سخت تنقید ہے ان کا مذاق اڑایا گیا ہے مگر ان کی گرفت نہیں ہوسکی۔ اکبر کی شاعری اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔

بحیثیت طنز نگار و مزاح نگار تو اکبر کی شاعری اہم ہے ہی لیکن ان کی وہ شاعری جو اس ضمن میں نہیں آتی وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے لیکن ہوا یہ کہ چونکہ ان کی شاعری پر طنز و مزاح کے اثرات غالب ہیں اس لیے ان کی سنجیدہ شاعری کو ہم نظر انداز کرتے رہے ہیں اور اس کی وجہ سے بھی اکبر کی شاعری کی صحیح قدر و قیمت جاننے میں کوتاہی ہوئی ہے۔ اکبر کی شاعری کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں اپنے عہد کے تمام رجحانات کی عکاسی ملتی ہے چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی اکبر سرکاری نوکر بھی تھے اور پینشن خوار بھی وہ حکومت سے ڈرتے بھی تھے اپنی صفائیاں بھی دیتے تھے مگر اس کے خلاف جو کچھ اپنی شاعری میں کہہ دیا وہ اس وقت کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی کہتے جھجکتے تھے انہوں نے سامراج کے جبر استبداد اور ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کے معاشی و اقتصادی استحصال کے خلاف آواز بلند کی:

تمہارے فریادیوں کو دیکھا تمہارے عزرات بھی سنے ہیں
خفا نہ ہو جاؤ تو یہ پوچھوں کسی کا دل تم سے شاد بھی ہے

اگرچہ ظلم سے دل مائل فریاد ہوتا ہے
مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے

جب تحریک ترک موالات شروع ہوئی تو حکومت نے اسے شدت سے کچلنا چاہا اکبر کو حکم ملا کہ اس کے خلاف شعر کہا اکبر سرکار انگریزی کے پینشن یافتہ تھے انہوں نے اس پر جو احتجاج کیا وہ ان کے کرب کا اظہار ہے:

بھرتے ہیں میری آہ کو فونو گراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

انگریزوں کی رائج کردہ تعلیم پر اس سے اچھا طنز اور کیا ہوسکتا تھا۔

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس

ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ
میں نے تو کر دیا ترا رتبہ بلند تر

از صحن خانہ تا بہ لب بام اذان من
وز بام خانہ تا بہ ثریا اذان تو

خود فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لیے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل

اظہار نا خوشی پہ وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ

تیرا ہی مشغلہ ہے بہت صاف و بے ضرر
آن اشتر ضعیف ولکدزن اذان من
واں گربہ مصاحب بابا اذان من

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ کی وہ گردشیں
خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں

نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا حضور یہ مضموں عجیب ہے

ہیں خود تو مست بادہ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ

انہوں نے اپنی شاعری میں ہر سیاسی واقعہ کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ اس پر اپنے نقطِ نظر سے تبصرہ بھی کیا ہے۔ چاہے مسجد کانپور کا قصہ ہو، یا جلیاں والا باغ کا خونیں حادثہ، تحریک ترک موالات ہو، یا گئو رکھشا کی تحریک، زبان سے متعلق اختلافات ہوں یا شیعہ سنی جھگڑے، مسلم لیگ ہو کہ کانگریس، بنگال کی تقسیم ہو یا تحریک خلافت۔

اکبر کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں انہوں نے کہیں براہ راست کہیں بالواسطہ وطن کی محبت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ دیکھا جائے تو ان کی شاعری کی بنیاد ہی اپنی تہذیب، مذہب، قوم اور ملک کی محبت پر ہے۔

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

بسکٹ کی اصطلاح انہوں نے انگریزوں کے لیے اور پوری کی ہندوؤں کے لیے اور چپاتی کی مسلمانوں کے لیے استعمال کی ہے۔ دیس بمعنی ملک کے بھی ہے اور دیس ایک راگ بھی ہوتا ہے۔اس شعر کو بھی اکبر کی قدامت پسندی کے ثبوت میں پیش کر دیا جاتا ہے کہ ان کو نئی چیزوں سے اس قدر تعصب تھا کہ بسکٹ کو ناپسند کرتے تھے اور پوری چپاتی کو اس سے بہتر جانتے تھے دوسری جگہ کہتے ہیں:

نغمہ یورپ سے میں واقف نہیں
دیس کی ہی یاد ہے بس دھن مجھے

وہ ہندیوں کو کمپنی بننے کی ہدایت بھی بار بار کرتے ہیں_

شخصی حالت کو چھوڑ کر ہندی
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ہند سے آپ کو ہجرت ہو مبارک اکبر
ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

اور ہندو مسلم اتحاد پر اکبر کی یہ رباعی تو اپنا جواب نہیں رکھتی_

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو

لاٹھی ہے ہوائے دہر تو پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اکبر کی شاعری کا مطالعہ ان کے عہد کے مطالعہ کے مترادف ہے۔

ویسے تو کسی نہ کسی حد تک سبھی شاعروں اور ادیبوں کے یہاں اپنے دور کی معاشرت اور سیاست کی جھلکیاں ملتی ہیں،لیکن اکبر کے یہاں جو وسعت اور تنوع ہے وہ اوروں کے یہاں نہیں ہے۔ان کی شاعری کا تین چوتھائی حصہ اپنے عہد کی سیاسی وسماجی حالات کا آئینہ دار ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور:

''اردو شاعری میں کوئی اور ایسا شاعر نہیں جس نے ایک معاشرت اور تہذیب سے اس طرح عشق کیا ہو اور اس کے مختلف پہلوؤں کو ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھ کر انہیں اپنے کلام میں محفوظ کر دیا ہو'' (۱۱)

اکبر کی شاعری میں وہ بات زیادہ اہم ہوتی ہے جو شعر کے پس منظر میں ہوتی ہے اسی لیے ان کی شاعری کے اصل معنی تک رسائی مشکل سے ہو پاتی ہے_ ہمارے دماغ اس بات کو قبول کر لیتے ہیں جو سامنے ہوتی ہے اس کے پس پردہ جھانکنے کی عام طور پر کوشش نہیں کی جاتی_ اکبر نے لمبی نظمیں اور قطعے بہت کم کہی ہیں ان کی شاعری زیادہ تر چھوٹے چھوٹے قطعوں،نظموں،رباعیوں اور مفرد اشعار پر مشتمل ہے۔لیکن وہ اکثر ایسے شعر تراشتے ہیں جو نشتر کی طرح دلوں میں چبھتے ہیں۔اکثر یہ اشعار اور قطعے دماغ میں ہیجان برپا کر دیتے ہیں اور ایک وسیع منظر سامنے لاکر کھڑا کرتے ہیں۔

اکبر کی شاعری کا بڑا مقصد قوم کو خودداری اور خوداعتمادی کا سبق سکھانا تھا دوسروں کی تقلید وہ بھی کورانہ تقلید کی خامیاں بتا کر اس سے باز رکھنا تھا وہ تہذیب جس کی نقل ترقی پسندی کی علامت بن گئی تھی اس تہذیب کی خرابیوں اور کمزوریوں کا احساس دلانا تھا غیر ملکی حکومت کے جبر واستبداد سے قوم کو باخبر کرنا تھا اور اکبر اپنے ان مقاصد میں بلاشبہ کامیاب ہوئے۔اکبر چونکہ ایک حساس اور جذباتی شاعر تھے وہ اپنے تصورات اور نظریات اس طرح نہ مرتب کر سکے نہ پیش کر سکے جس کی تطبیق نئے زمانے پر ہوسکتی_ مذہب،تہذیب،حکومت اور قوم وملت کے مسائل کا تجزیہ اکبر عقلی وفلسفیانہ سطح پر نہ کر سکے۔

ہر شاعر عظیم نہیں ہوتا نہ ہوسکتا ہے لیکن جو عظیم شاعر ہوتے ہیں ان کی عظمت میں ان کے پیش روشاعروں کی روایات کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہوتا ہے۔
اکبر کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو طنز و مزاح کے گراں قدر سرمایہ سے مالا مال کیا ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ:

''اردو ادب میں طنز وظرافت کا سلیقہ اور صحیفہ غالب اور اکبر کا دیا ہوا ہے۔'' (۱۲)

اور یہ کہ اکبر کی شاعری سے ہم اپنی تہذیبی اقدار سے محبت کرنا سیکھتے ہیں۔

اکبر کے جو مرنے کی خبر ساقی نے سنی تو خوب کہا
مرنا تو ضروری تھا ہی اسے رندوں کے لیے کچھ کر بھی گیا

اور اکبر کے اس کچھ کرنے کی اہمیت کو سمجھنا ہی ضروری ہے۔ جب ہم یہ سمجھ لیں گے تو اکبر کی شاعری کی اہمیت اور اردو ادب میں ان کے مقام کو بھی جان لیں گے۔

منابع و مراجع :

(۱) فلسفہ جمال ریاض الحسن، صفحہ۔ ۴۷
(۲) مقدمہ اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۱۰
(۳) مقدمہ اردو شاعری میں ہیت کے تجربے: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص۔ ۹
(۴) کچھ اودھ پنچ کے بارے میں: چکبست، نقوش طنز و مزاح نمبر، ص۔ ۲۵
(۵) ہنسی کی ابتدا: ڈاکٹر اعجاز حسین، نقوش طنز و مزاح نمبر، ص۔ ۱۲
(۶) مزاح اور مزاح نگاری: ڈاکٹر وزیر آغا، نقوش طنز و مزاح نمبر، ص۔ ۲۶
(۷) مزاح اور مزاح نگاری: ڈاکٹر وزیر آغا، نقوش طنز و مزاح نمبر، ص۔ ۲۷
(۸) اردو ادب میں طنز وظرافت: کلیم الدین احمد، سخنہائے گفتنی، ص۔ ۳۱۷
(۹) اردو ادب میں طنز وظرافت: کلیم الدین احمد، نقوش طنز و مزاح نمبر، ص۔ ۵۰
(۱۰) اکبر کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک نظر: سید شبیہ الحسن نونہروی، علی گڑھ میگزین اکبر نمبر ص۔ ۲۰۱
(۱۱) اکبر کا المیہ: آل احمد سرور، ۱۹۴۹ کا بہترین ادب ص۔ ۷۹
(۱۲) عزیزان علی گڑھ: رشید احمد صدیقی ضمیمہ قومی آواز تیرھویں قسط)

طنز ومزاح کا شہنشاہ اکبرالہ آبادی

19 ویں صدی کا نصف آخر ہندوستانی تاریخ کا انتہائی نازک دور ہے۔ 1857 کا انقلاب ناکام ہو جانے کے بعد ہندوستانی سماج پر انگریزوں اور انگریزیت کا دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ انریزوں کے پٹھو سرگم ہو چلے تھے۔ جانے۔ انجانے مغربی تہذیب وتمدن کی اندھی نقل ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً گوروں کے ارد۔ گرد کالے انگریزوں کی ٹولیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ایسے میں الہ آباد سے ایک آواز گونجی:

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا ،مغربی پتے صنم ہوں گے

یہ اکبرالہ آبادی تھے۔ اردو کے بیشتر شعرا کی طرح اکبرالہ آبادی نے بھی ابتدا میں عشقیہ غزلیں ہی کہیں لیکن بدلتے وقت کے تقاضوں نے جلد ہی ان کی شاعری کا رخ اور رویہ بدل دیا۔ اکبر نے طنز ومزاح کے سہارے ہماری روایتی اقدار سے ٹکرا رہے منفی رویوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ ابتدائی مظاہر اودھ پنچ میں جلوہ گر ہوئے اور پھر ان کی فنکاری، پرکاری اور کاٹ میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی شوخ طبیعت نے ظرافت کے نئے رنگ وآہنگ دریافت کئے۔ اور پھر یہی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری اکبرالہ آبادی کا شناخت نامہ ٹھہری۔ اکبر کے یہ اشعار تیر ونشتر ہیں اور ان کے اپنے اپنے نشانے بھی۔ بول چال کے لفظوں میں بنے اکبرالہ آبادی کے اشعار بظاہر بھلے ہی ہنسی ٹھٹھولی کا سامان لگیں لیکن ان کے اندر فکر ومعنیٰ اور سنجیدگی کی بہت سی پرتیں پوشیدہ ہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کا تخلیق زمانہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ انہوں نے 1857 کا ہنگام، اس کے بعد اچانک تیز ہوئے فرنگی مظالم، دوسری عالمی جنگ کا آغاز اور انجام، سب کچھ دیکھا اور بھوگا تھا۔ ان کی شاعری کا خمیر انہیں احساسات وتجربات سے اٹھتا ہے۔ اکبرالہ آبادی کی شاعری اپنے وقت کا آئینہ ہے، جس میں وقت اور سماج کے مختلف پہلو اپنی اچھائیوں اور رائیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سماج کے ان سیاہ پہلوؤں کی طرف بھی انگلی اٹھائی ہے، جو عموماً نظر نہیں آتے یا پھر نظر انداز کر دئے جاتے ہیں۔ سرکاری ملازم ہونے کے سبب اکبرالہ آبادی نے عام طور پر انگریزوں پر کھلکر تو چوٹ نہیں کی لیکن ان کی شاعری میں انگریزوں کے خلاف غصہ کی رمق بہر حال نظر آتی ہے۔ شائد نوکری کی مجبوریاں اور ادبی ذمہداریوں کی کشمکش ہی انہیں طنز ومزاح کی طرف لے آئیں۔ دل کی اس بات کا جس کا سیدھا بیان خطرناک ہوسکتا تھا اکبر نے طنز ومزاح کے پیرائے میں پیش کرنا کیا۔ اکبر نے اپنے انداز میں انگریزوں کی کھلی بھی اڑائی ہے اور ان کی چالوں سے لوگوں کو ہشیار بھی کیا ہے مگر اپنے انداز میں:

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں، میں تو انگریز سے ہی ڈرتا ہوں

مجموعی طور پر دیکھیں تو اکبرالہ آبادی کے اشعار کے اصل مطالب اشاروں اور کنایوں کی لہروں پر رواں دواں نظر آتے ہیں۔ انہیں سمجھے بغیر نہ تو شعر سمجھ میں آئے گا اور نہ ہی اکبرالہ آبادی۔ ان کے بعض قطعات پر پہلی نظر میں انگریز پرستی کا دھوکہ ہوسکتا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو بین السطور ان میں گہرے اور تلخ طنز پوشیدہ ہیں:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں

جگہ بھی ملتی کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

ڈاکٹر لئیق رضوی

طرح طرح کے بنالو لباس رنگارنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں اگر اکبر
تو حرج کیا ہے ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

اکبرالہ آبادی نے عمومی طور پر فرنگی حکومت پر عام طور پر سیدھے اور سپاٹ تبصروں سے پرہیز کیا ہے لیکن اس شعوری احتیاط کے باجود کہیں کہیں ان کے احتجاج کی لے اور طنز کی دھار بہرحال تیز ہوجاتی ہے:

یہ بات غلط کی ملک اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملک لکشمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگریز
یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

اکبرالہ آبادی بنیادی طور پر ہندوستانی تہذیب کے پرستار ہیں اور ان کی شاعری اس کی حمایت میں کھڑی ہوئی ہے۔ اکبر جس زمانے میں لکھ رہے تھے وہ تمدنی تصادم کا دور تھا۔ ہندوستان کی روایتی گنگا جمنی تہذیب پر مغربی تہذیب اثر انداز ہو رہی تھی۔ نوکریوں کی مجبوری یا پھر انگریز حکام سے قربت کے شوق میں لوگ اس پردیسی طور طریقوں کو اپنا رہے تھے۔ مغربی رہن سہن، پہناوے، کھانے پینے میں ہی نہیں، بول چال میں بھی انگریزی لہجے کی نقل ہونے لگی تھی۔ اکبر نے اس بھونڈی نقالی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ اسے سیاسی اور معاشرتی خطرے کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ انہیں کہیں نہ کہیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ مغربی طور طریقے کی اندھی اور اندھا دھند نقل ہماری روایتی تہذیب کے اقدار کو نگل جائے گی۔ اکبرالہ آبادی کی یہ تشویش ان کے اشعار میں جا بجا جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انہیں یہ بھی لگتا تھا کہ اس بدیسی تہذیب کی جڑیں جتنی گہری ہوتی جائیں گی، انگریزوں سے نجات اتنی ہی مشکل ہوتی جائے گی۔ ایسے میں طنز و مزاح کو ہتھیار بنا کر اکبرالہ آبادی نے ان رویوں کی پرزور مخالفت کی۔ اکبر کی یہ جنگ بڑی اور گہری ہے۔ یہاں ان کی شاعری اپنے پورے رنگ میں نظر آتی ہے۔ اپنی بات کہنے کے لئے اکبرالہ آبادی نے بول چال کی زبان کو وسیلہ بنایا۔ کردار آس پاس سے اٹھائے۔ مانوس علامتوں اور تشبیہوں کو نئے رنگ و آہنگ بخشے۔ یہ انداز ان کے اشعار میں ایک خاص لطف پیدا کر دیتا ہے۔ معمولی اور سبک الفاظ کو بھی انہوں نے اس فنکاری سے برتا ہے کہ ان میں ادبی حسن پیدا ہو گیا۔ بازاری محاورے جو اچھے نہیں مانے جاتے اکبر کے یہاں بلا کا مزہ دیتے ہیں۔ انگریزی لفظیات کے استعمال اور تکرار سے انہوں نے مزاح کے دلچسپ موقعے تلاش کئے ہیں۔ مس، کلرک، بی اے، انجن، پائپ، ٹائپ، کوٹ، پتلون، ہیٹ وغیرہ ان کے بولتے ہوئے استعارے ہیں۔

واہ کیا سج دھج ہے میرے بھولے کی
شکل کوے کی ہیٹ سولے کی
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر
گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں
پھر بھی سید ہیں نہایت نیک ہیں
اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پہ شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

گئے شربت کے دن یاروں کے آگے اب تو اے اکبر
کبھی سوڈا کبھی لیمنڈ کبھی وہسکی کبھی ٹی ہے

اکبرالہ آبادی ان تمام لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو انگریزی تہذیب کے مارے ہوئے ہیں:

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے
داڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظام صفائی کا کیا کروں

اکبرالہ آبادی خوب جانتے تھے کہ انگریز اپنی سیاسی ضرورتوں کے لئے میونسپلٹی سے لیکر کونسل تک میں ہندوستانیوں کو چاہے جو جگہ دے رہے ہوں لیکن ان کے اختیارات محدود ہیں۔ وہ نام کے آنریبل ہیں، اصل فیصلے انگریز ہی کرتے رہے گے۔ انہوں ان حقائق کو بار بار زبان دی ہے:

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندھان ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نابدان ہیں

معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کے بڑھتے رجحان کو بھی اکبرالہ آبادی مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ لارڈ میکالے کی اس تعلیمی پالیسی کو بار بار نشانہ بناتے ہیں، جس کا بنیادی مقصد کہیں نہ کہیں فرنگی حکومت نواز ذہن بنانا اور سرکاری مشینری کے لئے کلرک پیدا کرنا بھر تھا:

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے؟ فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے؟ فقط سرکاری ہے

اکبر نے حکومت کی تعلیمی پالیسی پر تو سوال کھڑے کئے ہی، اس کے جال میں پھنس کر محض دو ٹکے کی نوکری کے لئے اپنی مذہبی اور تہذیبی تشخص کو قربان کرنے پر تلے لوگوں کو بھی نشانہ بنایا:

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت تو بہ توبہ
ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے ،نوکر ہوئے، پینشن ملی اور مر گئے
چھوڑ لیٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اپنی مزاحیہ شاعری میں اکبرالہ آبادی نے غزل کی مانوس لفظیات ، علامتوں اور محاروں کو بھی برتا ہے لیکن بدلے ہوئے رنگ و آہنگ کے ساتھ۔ یہاں حسن و عشق ہے اور لیلیٰ مجنوں بھی مضامین کی نیرنگی اور برتاؤ کی ندرت نے ان میں مزاح کا پٹ پیدا کر دیا ہے:

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

ایسے میں اکبر الہ آبادی پر نئی تعلیم کی مخالفت کا الزام بھی لگا لیکن اکبر الہ آبادی کے پاس اپنا جواب تھا۔ اپنی دلیلیں۔ وہ روایت اور جدت میں توزن کے طرفدار تھے:

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے کہ نہ کر حسرت لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معنیٰ کو نہ بھو
راہ قومی کا تو کر نہ خود ہی نہ رہزن پیدا
دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو
مذہبی درس الف بے ہو علی گڑھ ت ہو

اکبرالہ آبادی ایسی تمام کتابوں کے خلاف ہیں، جو روایتی قدروں سے دور لے جاتی ہیں:

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

زبان، مذہب اور تہذیب پر خطروں کا یہی خوف اکبر کے لہجے میں کڑواہٹ بھی بھر دیتا ہے۔ کئی بار ان کا نظریہ بے حد تنگ بھی ہو جاتا ہے۔ تعلیم نسواں کے معاملے میں یہ خلش اور ابھر کر سامنے آتی ہے:

جاتی ہے اسکول میں لڑکی تو کچھ حاصل کرے
کیا ہوا حاصل اگر بے باک ہوکر رہ گئی

اکبر کے ان خیالات پر اعتراض ہیں اور ہو بھی سکتے ہیں لیکن صرف شاعری کے فن کے لحاظ سے دیکھیں تو اس میں ایک حسن نظر آئے گا۔

اکبر عام لوگوں کی فکر کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ بدھو اور جمن، اپنی جڑوں سے جڑے عام ہندوستانی کے استعارے ہیں۔ ان کے حق اور جذبات سے کھلواڑ کرنے والے ہر کسی کو اکبر الہ آبادی نے خوب خوب نشانہ بنایا ہے۔ خواہ وہ سیاسی لیڈر ہوں یا پھر مولوی:

مولوی ہرگز نہ چھوڑیں گے خدا گر چھوڑ دے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سز ا ہو یا نہ ہو
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

کونسل کی ممبری کی لالچ میں دین ایمان طاق پر رکھ دینے والے اکبر کا پہلا نشانہ تھے۔ اکبر نے جب بھی موقع ہاتھ آیا، ایسے لوگوں کے چہروں سے مکھوٹے کھینچ لئے ہیں:

شیخ کو وجد میں لاتی ہیں پیانو کی دھنیں
پیچ دستار فضیلت کے کھلے جاتے ہیں
ٹفن نفیس سڑک خوشنما ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر !یہ خوب کہی
مے خانہ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
عوض قرآن کے ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت انساں وہاں بندر اچھلتے ہیں
برگد کے مولوی کا کیا پوچھتے ہو کیا ہے
مغرب کی پالسی کا عربی میں ترجمہ ہے
حریفوں نے رپٹ لکھوائے ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبرنام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یا پھر یہ اشعار دیکھئے:

اکبرالہ آبادی پر بنیاد پرستی کا الزام ہے لیکن سچ یہ بھی ہے کہ کئی مقام پرانہوں نے وقت کے نئے تقاضوں کے وکیل بنکر بھی سامنے آتے ہیں:

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو
یہ دال لب گنگ کبھی گل نہیں سکتی
کلو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

یہی نہیں نئے تقاضوں کونظر انداز کرنے یا خود کوانکے مطابق تیار نہ کرنے والوں کو بھی اکبر بخشتے نہیں:

شیخ جی پر یہ قول صادق ہے
چاہ زم زم کے آپ مینڈک ہیں

اکبرالہ آبادی کی مزاحیہ شاعری جامع اور وسیع ہے۔ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف حس مزاح اور طنزیات کی لہر در لہران کے اشعار کو دلکشی بخشتی ہے۔اکبرالہ آبادی کے سیاسی نظریہ اور سماجی اصلاح کے ان کے پیمانوں پر سوال ہو سکتے ہیں، ہونے بھی چاہئیے لیکن طنز ومزاح کے شاعر کے طور پر ان کی اہمیت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔آپ ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کے اشعار کی شوخی اور بے باکی مسکرانے پر مجبور کر ہی دیتی ہے۔اکبرالہ آبادی نے سماج کے حال، بے میل سیاسی وسماجی صورتوں کو ہی آئینہ نہیں دکھایا بلکہ مستقبل کی آہٹوں کو بھی سامنے رکھا ہے۔ان کا پیرائیہ اظہار بھلے ہی مزاحیہ تھا لیکن ان کے مقاصد بہر حال سنجیدہ تھے۔اردو میں طنز ومزاح کی روایت کو سینچنے میں اکبرالہ آبادی کی خدمات تاریخی ہیں اور تاریخ ساز بھی۔اپنی شوخ مزاجی، دلکش ظریفانہ اسلوب اور فنی نیرنگیوں سے انہوں نے جو راہ استوار کی بعد میں طنز ومزاح گوئی کا کارواں اسی پر آگے بڑھا۔

اکبرالہ آبادی تصوف کے تناظر میں

الہ آباد (پریاگ راج) کو گنگا جمنی تہذیب کا سنگم قرار دیا گیا ہے۔ اکبرنامہ اور آئین اکبری کے مطابق شہنشاہ اکبر نے 1574ء کے آس پاس ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور 1583ء میں ایک نیا شہر قائم کیا جس کا نام 'الہ آباد' رکھا جو صدیوں سے روحانیت کا منبع بنا ہوا ہے۔ یہاں علما و مشائخ اور سادھوؤں وسنتوں کا ہمیشہ آمد و رفت رہا ہے، جس کے باعث ہر مذہب و مسلک کے لوگ 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' کے مصداق اور امن و شانتی کے پیکر نظر آتے ہیں۔ یہ شہر دور قدیم سے ہی علم کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ عرصہ دراز سے یہاں یونیورسٹیوں، کالجوں اور تحقیقی اداروں کا مرکز قائم ہے جس میں الہ آباد یونیورسٹی کو اپنا ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہاں اردو کے بہت سارے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی شاعری اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ خوابیدہ قوم کو بیدار کیے اور نوجوانوں کے مردہ قلوب میں روح پھونکے۔ وقتاً فوقتاً اپنی تقریر و تحریر اور شاعری کے ذریعہ ان کے لہو کو گرماتے رہے اور ان میں زندہ دلی کے جذبات پیدا کرتے رہے۔ انہیں اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرنے اور اپنی دنیا آپ بنانے کی تلقین کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ادبا اور شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جس میں اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی طنز و مزاح کے علم بردار قرار دیے گیے ہیں۔ وہ اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ذریعہ تاعمر نشتر زنی کرتے رہے جس سے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سد باب ہوتا رہا۔ ان کا طنزیہ انداز اس طرح تھا کہ عزت نفس مجروح بھی نہ ہوتی اور انسان اپنی اصلاح بھی کر لیتا تھا، اسی طرح مزاحیہ انداز بھی خوب تھا۔ کمال یہ کہ شعر سنتے ہی غم زدوں، دل جلوں اور دردمندوں کے چہرے کھل اٹھتے ہیں جس سے ٹوٹے ہوئے دل آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ دراصل اکبر الہ آبادی ایک صوفی منش انسان تھے۔ تصوف ان کے رگ و پے میں سرایت کی ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول صوفیانہ تھا اور اسی بود و باش میں آنکھ کھولی۔ سلسلہ ابوالعلائیہ نقشبندیہ اور چشتیہ میں شاہ قاسم داناپوری سے بیعت تھے۔ خطوط اکبر سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ حسن نظامی، مہاراجہ کشن پرشاد، ڈاکٹر اقبال، سید عشرت حسین، احسن مارہروی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سر شیخ عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، سید سرور شاہ گیلانی، شاہ اکبر داناپوری اور وحید الہ آبادی وغیرہ سے اچھے مراسم تھے، جن سے اکثر و بیشتر تصوف کے اسرار و رموز پر گفتگو کرتے تھے۔ وہ تصوف میں جہاں وجودی نظریہ کے پاسدار تھے وہیں شہودی نظریہ کے مقلد بھی تھے۔ ماسوا اللہ ہر چیز معدوم ہے اور ہر شے میں خدا موجود ہے، وحدۃ الوجود ہے۔ یعنی لوہے کو آگ میں ڈالنے پر لوہا آگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اب وہ لوہا نہیں، آگ ہے۔ اسی وجودی نظریہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اکبر الہ آبادی کہتے ہیں ۔

الہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے

اسی طرح وحدۃ الشہود نظریہ کے بھی اشعار ملتے ہیں۔ ہر شے میں خدا کا نور ہے۔ اللہ اور شے ایک نہیں بلکہ دونوں کے وجود الگ الگ ہیں۔ آفتاب کی روشنی کے سامنے ستاروں کی چمک معدوم تو ہوتی ہے مگر ستاروں کا اپنا وجود اپنی اصل حالت میں باقی رہتا ہے، وحدۃ الشہود ہے۔ اس ضمن میں کہتے ہیں ۔

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے (1)

واضح ہو کہ اوپر ذکر کیا ہوا پہلے شعر میں سبھی صورتیں خدا کی ہیں، یعنی ہر ذرے میں خدا جاگزیں ہے، وجودی نظریہ ہے۔ من و عن دوسرے شعر میں ذرہ اور انوار الہی دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، یعنی عبد اور خدا کا وجود الگ الگ ہے، شہودی نظریہ ہے۔ وہ فنا (وجود) اور بقا (شہود) کے راہ رو ہیں۔ فنا کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا (2)

ڈاکٹر طالب اکرام، چھیتے مئو، مئو آیمہ، پریاگ راج، یوپی

اکبرالہ آبادی اپنے مرشد میں اس قدر فنا تھے کہ اب کسی بھی پیر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
تیار تھے نماز پہ ہم سن کے ذکر حور
جلوہ خدا کا دیکھ کے نیت بدل گئی(3)

طریقت کی رو سے راہ سلوک کے تین منازل ہوتے ہیں۔ فنا فی الشیخ ،فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ۔ جب بندہ اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ طلسم انا کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ شہوت ، ہوس، حرص،طمع، ریا، مکر، فریب،تکبر، غرور، جھوٹ اور غیبت وغیرہ کے عناصر کو حذف کر قلب مزین کر لیتا ہے تو مقام ’الہٰ‘ پر گامزن ہوجاتا ہے اس کا دل خدا کے نور سے معمور ہوجاتا ہے اور مرشد میں فنا ہو کر توجہ شیخ سے فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔ اسی منزل فنا فی الشیخ کا ذکر کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی کہتے ہیں ۔

وہ تو موسیٰ ہوا جو طالب دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمہیں دیکھا ہوگا(4)

اسی طرح شہود کا نظریہ پیش کرتے ہوئے ’خدا اور بندہ‘ کا وجود فرداً فرداً بتاتے ہیں اور عشق بتاں (مرشد کے عشق) میں زندگی لطف اندوز اور پر کیف ہے۔ ان پر عشق اس قدر غالب ہے کہ بجز مرشد دیگر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اس ضمن میں کہتے ہیں ۔

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزہ
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جایے گا(5)

وہ تصوف میں وجود اور شہود کے بحث میں الجھنا فضول گمان کرتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں دونوں رنگ اغلب ہیں۔ ان کے نزدیک الفاظ کے پیچوں میں الجھنا محض وقت کا زیاں ہے۔ جس نے بحث ومباحثہ کو بالائے طاق رکھا کامیاب ہوا اور جس نے پاسداری کی اپنے مقصد میں ناکام ہوا اور بحث و مباحثہ فقط اہل ظاہر کا شغل ہے۔ دراصل انہیں حقیقت سے آشنائی نہیں ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے اہل ظاہر بات بات پہ تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ جس سے اخوت ومحبت اثر انداز ہوتے ہیں اور ایکتا کی لڑی پوری طرح بکھر جاتی ہے۔ ان پر انانیت کا غلبہ اس قدر رہوتا ہے کہ اپنی لغزشوں کا احساس تک نہیں ہوتا اور تاعمر بحث وجدال کو گلے لگائے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
اہل ظاہر جس قدر چاہیں کریں بحث و جدال
میں یہ سمجھا ہوں خودی میں تو خدا ملتا نہیں(6)

دراصل اہل ظاہر حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور اپنی کم علمی کے بنا پر انا کے شکار ہوتے ہیں۔ خود کو مختار اور دوسروں کو محتاج سمجھتے ہیں۔ اپنے ظاہری علم وعمل کے خواب میں گم ہوتے ہیں۔ جس طرح سے ایک پرندہ گھونسلہ میں مقیم ہونے پر یہ گمان کرتا ہے کہ دنیا یہی ہے، حالاں کہ پرندہ جب پرواز کرتا ہے تو اسے یقین ہوجاتا ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ کما حقہ اہل ظاہر کے بھی یہی حال ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جتنا خود کو علم حاصل ہے بس یہی آخر ہے اور اپنے خودی میں ڈوبے ہوئے اتراتے پھرتے ہیں اور اپنے ظاہری علم وعمل کو حقیقی تصوف گمان کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس اکبرالہ آبادی کہتے ہیں ۔

سخن میں یوں تو بہت موقع تصوف ہے
خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے(7)

علم اور عمل ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں۔بغیر علم عمل ناقص اور عمل کے بغیر علم بے سود ہوتا ہے۔ ہر انسان کو علم اور عمل کا پیکر ہونا چاہیے، خاص طور پر ایک صوفی کے لیے علم وعمل سے آراستہ ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔بعض تو علم اور عمل دونوں خالی سے ہوتے ہیں لیکن بظاہر خود کو ایسے آراستہ رکھتے ہیں گویا زمانہ کے سب سے بڑے صوفی معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔اکبرالہ آبادی ایسے ہی مصنوعی صوفی کے ضمن میں کہتے ہیں ۔

مادہ سب میں یہ ہوا کہ خیال خام ہے
اک مذاق طبع ہے جس کا تصوف نام ہے (8)

اسی طرح مزید کہتے ہیں۔

نہ صورت کا تصنع ہے نہ رسموں کا تکلف ہے
شریعت کی بہ دل تعمیل ہو بس یہ تصوف ہے(9)

صوفیا کے نزدیک محض ظاہری علوم سے آراستہ ہونا تصوف نہیں ہے بلکہ علم باطن کے اسرار و رموز سے واقف ہونا اور عمل صالح سے مزین ہونے کو تصوف کہتے ہیں۔ بندہ فقط کلام اللہ کو اپنے پیش نظر رکھے اور خدا کا جلوہ ہر شے میں مشاہدہ کرے۔جس طرح سے مردہ جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوتی ہے من و عن ہمیں بھی خود کو رب کے سپرد رکھنا چاہیے۔کسی کے ایذا پہنچانے پر تحمل سے کام لینا چاہیے اور من جانب اللہ تصور کرنا چاہیے۔ بقول ایک چشتی بزرگ ''ہمیں مثل زمین ہونا چاہیے کیوں کہ زمین خود کو رب کے سپرد رکھتی ہے، اس کے سینے کو چاک کرنے پر بدلہ نہیں لیتی بلکہ سبزہ اگاتی ہے۔ پھل اور میوے سے مستفیض کرتی ہے۔''(10) لہذا ہمیں بھی قرآن مقدس کے تعلیمات کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور ہر فعل کا صدور حق کی جانب تسلیم کرنا چاہیے۔جیسا کہ اکبرالہ آبادی کہتے ہیں۔

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیش نظر یہ ہے تصوف(11)

صوفیا تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیہ روح پر بہت زور دیتے ہیں۔ کیوں کہ راہ سلوک پر چلنے والے کے لیے اپنے ظاہر اور باطن کی اصلاح کرنا لازم و ملزوم ہوتا ہے۔اس لیے وہ سالک کو ذکر الٰہی کی تلقین کرتے ہیں۔ طالب کے لیے ہمہ وقت اپنے مرشد کو تصور میں رکھنا عین ضروری ہوتا ہے۔ مرید اپنے مرشد سے جس قدر لو لگاتا ہے کماحقہٗ فیضیاب ہوتا ہے۔ وہ پاس انفاس (ہر نئی سانس کے ساتھ 'اللہ' کو باہر کرے اور 'ھوٗ' کو اپنے اندر جزب کرے) کے ذریعہ منزل مقصود تک رسائی حاصل کرتا ہے۔لیکن راہ سلوک کے منازل طے کرانے کے لیے مرشد کا کامل ہونا فرض عین ہے۔ اگر مرشد کا ظاہر اور باطن صیقل و منزہ نہیں ہے تو منزل مقصود تک رسائی ناممکن ہے۔جیسا کہ دور حاضر میں بیشتر صوفیا کا ظاہر تو سرمایہ زیب وصفا ہوتا ہے لیکن باطن انوار الٰہی سے خالی ہوتا ہے۔ اکبر اسی ضمن میں طنزیہ نشتر چلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

صرف ظاہر ہوگیا سرمایہ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں(12)

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جہاں مرد کامل حقیقت میں رونق افروز ہوتا ہے وہاں طالب صادق نظر نہیں آتا۔شیخ کامل تو مائل بہ کرم ہوتا ہے مگر رہ رو منزل دکھائی نہیں دیتا۔اس لیے راہ سلوک پر چلنے والا صادق ہونا چاہیے۔اس کا عزم مستحکم اور حوصلہ بلند ہونا چاہیے۔مخلوق خدا کے ساتھ اسے خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے کیوں کہ 'یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم' کا نام تصوف ہے۔طالب کو چاہیے کہ اپنے شیخ کو مثل آفتاب تصور کرے جس طرح آفتاب کی کرنوں سے سارا عالم روشن و منور ہوتا ہے من وعن مرشد کے رخ تاباں سے سارا جہان منور ہے، کامل یقین ہونا چاہیے۔اسے ہر شے میں مرشد کا جلوہ دکھائی دے اور 'سانسوں کی مالا پہ سمروں میں پی کا نام' مزین ہونا چاہیے۔مگر ایسے طالب صادق بمشکل نظر آتے ہیں جو درد آشنا ہوں اور سلوک کے منازل طے کرنے کے خواہاں ہوں۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں۔

غافلوں کو کیا سناؤں داستانِ عشقِ یار
سننے والے ملتے ہیں درد آشنا ملتا نہیں
منزل عشق توکل منزلِ اعزاز ہے
شاہ سب بستے ہیں یاں کوئی گدا ملتا نہیں (13)

ایک طالب کے لیے کلمہ طیبہ کے سبھی درجات کو طے کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ بغیر ان درجات کو طے کیے خدا کی معرفت حاصل کرنا محال ہے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ کلمہ طیبہ کے چھ درجات ہوتے ہیں: لا، الہ، الا اللہ، محمد، رسول اور اللہ۔ 'لا' کے معنی 'نہیں' کے ہیں۔ جب طالب ذکرِ الٰہی کے ذریعہ حسد، بغض، کینہ، مکر، فریب، جھوٹ، غیبت، ریا، تکبر، حرث، طمع، ہم اور انا وغیرہ کے عناصر سے پاک و صاف ہو جاتا ہے تو 'دل میں 'الہٰ' کا ظہور ہوتا ہے۔ 'الہٰ' (معبود) جس کی عبادت کی جائے۔ عبد کے قلب میں جب معبود جاگزیں ہو جاتا ہے تو وہ درجہ 'الہیہ' سے درجہ 'الا اللہ' پر پہنچتا ہے اور جب اس کے دل میں اللہ کے سوا ہر چیز معدوم ہو جاتی ہے تو جس کی سب سے زیادہ تعریف و توصیف بیان کی گئی ہے یعنی درجہ 'محمدیہ ﷺ' پر فائز ہو جاتا ہے۔ پھر جب نورِ محمدی دل و جاں میں جلوہ گر ہو جایے تو وہ درجہ 'رسول' پر پہنچتا ہے اور جب اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نور اس کے رگ و پے میں سرایت کر جائے تو درجہ 'اللہ' پہ گامزن ہو جاتا ہے۔ اب اسے ہر شے میں اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ ایک دوسرے میں امتیاز نہیں کر پاتا ہے۔ عقل جسے سمجھنے میں قاصر رہتی ہے۔ بلکہ ہر شے میں رب کا جلوہ دکھائی پڑتا ہے۔ اکبرالہ آبادی بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے
تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا (14)

اس کے برعکس گرچہ سالک درجہ 'لا' کے حدود کو پار نہیں کیا ہے اور اپنے خودی ہی میں غرق ہے، انا میں چور ہے تو رب کی رفاقت اور خدا کی معرفت غیر ممکن ہے۔ اس کے لیے حق کا قرب حاصل کرنا محال ہے۔ اسے حقیقت خداوندی سے دور تک کا بھی واسطہ نہیں ہوسکتا۔ حق کے راز و نیاز سے روشناس ہونا اس کے لیے آسمان سے تارے چاک کر اپنے دامن میں سمو لینے کے مترادف ہوتا ہے۔ جیسا کہ اکبرالہ آبادی کہتے ہیں۔

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتا ملتا نہیں (15)

اکبر نے ملک و ملت کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ جب ان کی پسماندگی اور پستی پہ غور و فکر کیا تو نتیجہ اخذ کیا کہ ملت کے نوجوان انا پرستی، بے عملی اور لاعلمی کے زہر آلود سمندر میں غوطہ زن ہیں جس سے ان میں جمود و سکوت اور غنودگی کی کیفیت طاری ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ذریعہ ملک و ملت کے نوجوانوں کو خوابیدگی سے بیدار کیا اور غنودگی و بے عملی کے دلدل سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں۔

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ (16)
کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو (17)
ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد ہیں وہ جو زمانے کو بدل دیتے ہیں (18)

اکبرالہ آبادی تقدیر پرستی کے قطعی قائل نہیں تھے۔ وہ اللہ پر توکل تو رکھتے تھے مگر اپنی دنیا قائم نہیں کرتے تھے بلکہ 'اپنی دنیا آپ پیدا کرنے' کے قائل تھے اور جمود و سکوت کے مجسمہ کو توڑ کر حرکت و عمل کا پیکر بننے کی کاوش کرتے تھے۔ وہ عمل پیہم سے اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرنے پر زور دیتے تھے۔ ان کے

نزدیک گرچہ انسان جامد وساکت ہو اور اس میں دنیا کو بدل دینے کا حوصلہ نہ ہو تو پھر وہ انسان مرد نہیں۔اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں (19)
کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر میں پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو(20)

لسان العصر ہمیشہ آپس میں مل جل کر رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ان کے نزدیک جس طرح لفظ 'محبت' کے تمام حروف مثل لڑی مربوط ہوتے ہیں کما حقہٗ ہر انسان کو آپس میں مل جل رہنا چاہیے۔وہ اپنے مذہب و مسلک اور مشرب پہ گامزن رہے مگر دریا میں موجوں کی طرح ایک رہے۔چوں کہ حسن اخلاق تصوف کا ایک اہم جزو ہے۔اس لیے وہ اخلاقیات پر بہت زور دیتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعہ کوشش کرتے تھے کہ انسانوں کے آپس میں ٹوٹے ہوئے قلوب جڑ جائیں۔شیخ فریدالدین گنج شکر کی خدمت میں ایک شخص نے قینچی پیش کی تو فرمایا مجھے سوئی دھاگہ دو، میں کاٹتا نہیں، جوڑتا ہوں۔(21)اسی سلسلے میں گجرات کے ایک چشتی بزرگ سید مشتاق علی شاہ المعروف حضور صوفیِ ملت فرماتے ہیں'' پیڑ کو پتھر مارنے پر پیڑ بدلے میں پھل دیتا ہے۔ہمیں بھی نفرت کے جواب میں محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے، اگر ہمیں کوئی گالی دے تو بدلے میں دعائیں دینا چاہیے یعنی برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا چاہیے، یہی صوفیہ کا مسلک ہے۔(22) گویا اکبرالہ آبادی اخلاق حمیدہ کے خوگر اور اوصاف جمیلہ کے پیکر تھے۔یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں تَخَلَّقُوْا بَاَخْلَاقِ اللّٰہ (اللہ کی مخلوق کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ) کا درس ملتا ہے۔وہ طنز و مزاح کو آلۂ کار بناتے ہوئے احسن انداز میں قوم کی اصلاح کرتے ہیں، جس سے انسان تمام تر خامیوں کو دور کر راہ راست پر گامزن ہو جاتا ہے۔اس سلسلے میں شعر ملاحظہ ہو۔

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بے زار نہ ہو(23)

صوفیا کے مطابق احسان کا کوئی بدل نہیں ہوتا ہے۔جس کے ذریعہ جانی دشمن کے سر بھی خم ہو جاتے ہیں۔ ہزار خوف ہو لیکن خوش کلامی اور احسان سے ایک لمحہ میں ٹل جاتے ہیں۔لہٰذا انسان کو ایک دوسرے کا یار و مددگار اور دل کا رفیق ہونا چاہیے۔اکبرالہ آبادی کہتے ہیں۔

یہ ہے کہ جھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن
سن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بہتر
انسان اگر معرفت حق سے ہو غافل
کیا شک کہ بہایم ہیں اس انسان سے بہتر(24)

اکبرالہ آبادی تصوف کی روحانیت کو بمقابل مغربی تہذیب مشرقی تہذیب پر ترجیح دیتے تھے۔وہ مشرقی تہذیب کے معتقد اور مغربی تہذیب کے منحرف تھے۔مغربی تعلیم اور طرز حیات کو قوم و ملت کے لیے گمراہی کا باعث قرار دیتے تھے، اس کی بڑی شد و مد سے مخالفت کرتے تھے۔وہ مادی خواہشات اور دنیاوی مسائل کے برائے تدارک تصوف کو بروئے کار لائے اور جہاں لاعلمی، بے عملی، بے حرکتی، بے رغبتی، تعطل اور جمود و سکوت کے عناصر نظر آئے اسے تنقید کا نشانہ بنایے۔یہی سبب ہے کہ تصوف میں وہ ارواح پرستی کے قائل نہیں تھے۔اسے رہبانیت اور افیون گمان کرتے تھے۔جس کا خدا پرستی اور انسان دوستی سے کوئی تعلق نہیں اور مذہب اسلام سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔کہتے ہیں۔

حامی میں تصوف کا دل و جاں سے ہوں لیکن
ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے(25)

شاعر جہان ڈاکٹر اقبال کو یہ ادا بڑی پسند آئی۔ان کے طرز عمل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ چار مرتبہ الہ آباد تشریف لایے۔1913ء اور 1920ء میں اکبرالہ آبادی سے ملاقات کے لیے آئے۔پھر اکبرالہ آبادی کے انتقال پر 1921ء میں تعزیت کے لیے آیے اور آخری مرتبہ 1930ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بطور صدر تشریف لائے۔الہ آباد آنے سے قبل 1910ء میں اقبال جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گیے تو ایک خطبہ بنام ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' دیا، جس میں اکبرالہ آبادی سے والہانہ انسیت کا اظہار کیا۔اکبرالہ آبادی نے دیکھا کہ علامہ اقبال بے حد متاثر ہیں اور ملاقات کے لیے کوشاں ہیں تو کہتے ہیں۔

نگاہیں کاملوں پر پڑہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر(26)

اسی طرح ڈاکٹر اقبال 9/نومبر 1911ء کو بنام اکبرالہ آبادی ایک خط ارسال کرتے ہیں جس میں لکھتے ہیں'' آپ کی ملاقات کو دل تڑپ رہا ہے۔خدا جلدی کوئی صورت پیدا کرے''(27) علامہ اقبال دراصل اکبرالہ آبادی کو اپنا معنوی مرشد تسلیم کرتے تھے۔یہی سبب ہے کہ ان سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔جیسا کہ اقبال نے 6/اکتوبر 1911ء میں بنام اکبرالہ آبادی ایک مکتوب رقم کرتے ہیں جس میں وہ ازخود معترف ہیں، لکھتے ہیں:

''میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت اور عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں، خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں، ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے''۔(28)

نیز 16/جولائی 1914ء میں ایک مکتوب ان کے نام مزید لکھتے ہیں جس میں انھیں اپنا مرشدِ برحق تصور کرتے ہیں۔(29) حالاں کہ فرمان فتح پوری نے اپنی معرکہ الآرا تصنیف 'اقبال سب کے لیۓ' (ص ۳۵) میں پیر جماعت علی شاہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اقبال خود اپنے والد شیخ نور محمد (میاں جی) سے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔(30) لیکن روحانی مرشد مولانا روم کو تسلیم کرتے تھے۔

یہ بات واضح رہے کہ جس طرح اقبال کو لسان العصر سے بڑی عقیدت تھی من و عن اکبرالہ آبادی کو بھی اقبال سے خاصا لگاؤ تھا اور انھیں اپنا ولی عہد اور جانشین بھی تسلیم کرتے تھے۔جیسا کہ 3/مارچ 1912ء کے ایک خط میں اکبرالہ آبادی نے ڈاکٹر اقبال کو اپنا معنوی جانشین قرار دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں۔

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم ہو جایے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

مدت کا پرانا شعر ہے۔دیکھا کہ وہ بارِ غم جو میرے دل پر مستولی تھا، آپ نے اٹھالیا۔وہی سمجھ اور بصیرت تھی جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن ترشوادی۔۔۔۔اب آپ کے سپرد چارج ہے۔ہم تو آپ کی ملاقات کی مسرت مول لینے کو مستعد ہیں۔''(31)

اسی طرح ایک شعر مزید ملتا ہے جس میں اقبال سے انسیت کا واضح ثبوت ملتا ہے، ملاحظہ ہو۔

دعویٰ علم و خرد میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکر اقبال آگیا(32)

ملحوظ خاطر رہے کہ اکبر اور اقبال کے درمیان اس قدر انسیت اور الفت ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں کے سینے میں ملت اسلامیہ کا درد تھا۔علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی سے مسلمانوں کو عزم و استقامت کی راہ دکھائی اور جداگانہ قومی وجود کی حرارت سے دلوں کو گرمایا اور ذہنوں کو جلا دی، جب کہ

اکبرالہ آبادی نے طنز و مزاح سے مسلمانوں کو مغربی روش پر چلنے کے نقصانات سے آگاہ کیا اور اسے ہدف تنقید بھی بنایا۔اقبالؔ اور اکبرؔ دونوں وکیل اور شاعر ہونے کے علاوہ ایک عظیم مفکر بھی تھے اور معاشرے کو اسلامی رنگ میں آگے بڑھانے کے لیے تجاویز دے رہے تھے۔اقبالؔ کی طرح اکبرالہ آبادی نے ہمیشہ اسلامی تہذیب کا پاس رکھا اور مسلمانوں سے یہی گزارش کی کہ وہ اپنی تابناک تہذیب و ثقافت سے دستبردار نہ ہوں۔ایک جگہ بحیثیت مصلح قوم کو پیغام دے رہے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں، سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو (33)

چوں کہ ایک کامیاب انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ علوم دینی اور دنیوی دونوں سے آراستہ ہو۔محض دین کو سمجھ لینا کامل نہیں اور فقط دیناوی علوم سے بہرہ ور ہونا بھی کامل انسان کی دلیل نہیں ہے۔اسی لیے اکبرالہ آبادی علوم بحر و بر سے واقفیت رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ان کے نزدیک تعلیم سے انسان کی زندگی خوش گوار ہوتی ہے۔اسے تہذیب یافتہ، ہنرمند اور جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔وہ کہتے ہیں ان تمام تر اوصاف و کمالات کے باوجود بھی ہماری قوم تعلیم سے محروم ہے اور غفلت کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔اسے خود کی فکر بھی نہیں ہے، اگر اصلاح کی جائے تو ناگوار گزرتا ہے۔ان کے چہرے کی سلوٹیں بدلنے لگتی ہیں۔انہیں مغربی تہذیب سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے تو بجائے گریز واجتناب برتنے کے گراں گزرتا ہے۔کہتے ہیں۔

بولے کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے
میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے (34)

ہر انسان کو تعلیم یافتہ ہونا عین ضروری ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔بغیر حصول تعلیم انسان مکمل نہیں ہوسکتا۔بلکہ اپاہج، گونگا، بہرا اور اندھا ہونے کے مترادف ہے کیوں کہ لاعلمی اور جہالت انسان کو پستی کی جانب لے جاتی ہے۔اسے جنگ وجدال کے لیے مجبور کرتی ہے۔جس سے معاشرہ میں ہراس وغنودگی کی فضا قائم ہوجاتی ہے۔اسی لیے اکبرالہ آبادی حصول علم پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی میں روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام (35)
کھینچوں نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو (36)

اکبرالہ آبادی حرکت وعمل سے بیزار اور جمود وسکوت کے طلب گار صوفیائے خام پر نشتر زنی کرتے ہیں اور ولایت کے نام پر بازار گرم کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ایسے نام ونمود صوفی جسے عبادت وریاضت سے کوئی سروکار نہیں ہے، خداپرستی کے بجائے محض پیر پرستی کے داعی بنے ہوتے ہیں، ایسے پیر خام جو صرف 'دیسی شراب' یعنی 'نگاہ پیر سے جام پینے' کے علاوہ دیگر عبادات سے روکتے ہیں، حتیٰ کہ فرائض وسنن اور نفلی عبادات سے بھی منع کرتے ہیں اور متوسلین، مریدین اور عاشقین کو فقط نگاہ پیر سے جام پینے اور ہمہ وقت مست رہنے کی بات کرتے ہیں، انہیں قنوطیت کا شکار بناتے ہیں، بجائے توکلت علی اللہ تعویذ، گنڈے اور پھونک جھاڑ پر منحصر رکھتے ہیں، لسان العصر ایسے صوفی خام سے برہم اور بیزار نظر آتے ہیں۔ان پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مرعوب ہوگیے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو (37)

وہ صوفیائے خام کی حقیقت سے اس قدر بیزار ہیں کہ ان کی زندگی تلخ ہوگئی ہے اور ہر آن صوفیائے حق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔اب اس

دار فانی میں انہیں کامل شیخ نظر نہیں آتا ہے جس سے اپنی دل کی دنیا آباد کرتے تھے اور وحدانیت کے جام سے ہمہ وقت شرابور رہتے تھے۔ ایک وقت تھا جب معرفت کے اسرار و رموز سے بہرہ ور کرانے والوں کی ایک جماعت تھی۔ الٰہی ایسے نازک دور میں ہمارے کشتیِ دل کی حفاظت کر اور ہمیں گمراہی سے بچا۔ ہمیں کسی مرد قلندر سے آشنا کرا اور اپنا قرب عطا کر۔ کہتے ہیں۔

جس پہ دل آیا ہے وہ شیریں ادا ملتا نہیں
زندگی ہے تلخ جینے کا مزہ ملتا نہیں
چل بسے وہ دن کہ یاروں سے بھری تھی انجمن
ہائے افسوس آج صورت آشنا ملتا نہیں (38)

اکبرالہ آبادی جہاں صوفیائے خام پر نشتر زنی کرتے تھے وہیں علمائے سو کو بھی نشانے پر رکھتے تھے، جو بظاہر زہد و تقوی کے پیکر تو ہوتے ہیں مگر حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے ساتھ اللہ والوں سے بھی عشق رکھنا اشد ضروری سمجھتے تھے۔ چوں کہ اہل اللہ اور غیر اللہ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس لیے اکبرالہ آبادی وحدہ لاشریک کے ساتھ غیر اللہ کو منسلک کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے اور اہل اللہ کو خدا سے جدا گمان کرنے پر بھی عظیم گناہ مانتے تھے۔ ان کے نزدیک مومن کے سینے میں عشق اولیا جاگزیں ہونا لازم و ملزوم ہے۔ وہ علمائے سو کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ ہیں باتیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے (39)

دراصل صوفیا دنیا کے طلب گار نہیں ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے وہ ہر چیز کو ناقص اور ہیچ سمجھتے ہیں۔ ان پر عشق حقیقی اس قدر غالب ہوتا ہے کہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ محض ذات واحد میں فنا ہوتے ہیں اور اسی کو اپنا حاصل گمان کرتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی چیز اپنے طرف مائل نہیں کر سکتی ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے حاصل کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی اسی حقیقت کو آشکار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں (40)

صوفیا ہر کام میں رب کی حکمت تلاش کرتے ہیں۔ وہ ہر چیز کا صدور من جانب اللہ گمان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی ہوتے ہیں۔ وہ صبر و شکر کا دامن تھام کر ہر مسئلہ پر غور و خوض کرتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ وہ کبھی پریشانیوں سے گھبراتے نہیں ہیں بلکہ لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے لیے مثبت معنی اخذ کرتے ہیں۔ اسی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی کہتے ہیں۔

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہ لو
ان کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے (41)

المختصر گرچہ اکبرالہ آبادی کا بچشم عمیق و دقیق مطالعہ کیا جائے تو تصوف کے آئینہ میں چمکتے ہوئے درخشندہ ستارہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ لہذا انہیں تصوف مخالف قرار دینا ان کے ساتھ ناانصافی اور حق تلفی ہوگی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ تصوف کے تناظر میں ان کے تئیں مثبت موقف رکھا جائے۔ اکبرالہ آبادی اپنے انہیں طنز و مزاح اور صوفیانہ افکار کے بنا پر اردو شعر و ادب میں منفرد اور یکتا مقام رکھتے ہیں۔ جب تک دنیا قائم رہے گی ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جاتا رہے گا۔

حوالہ جات:

(1) کلیات اکبرالہ آبادی، ح ۲، سید اکبر حسین، اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد ۱۹۲۶ء، ص ۲۹
(2) کلیات اکبرالہ آبادی، احمد محفوظ، ج ا، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی ۲۰۰۲ء، ص ۲
(3) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷
(4) کلیات اکبرالہ آبادی، احمد محفوظ، ج ا، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی ۲۰۰۲ء، ص ٦
(5) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰
(6) کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۸۰
(7) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۹۵
(8) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۷
(9) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۰۹
(10) خلیفہ صوفی ملت سید واحد علی شاہ ولی عہد آستانہ فیض الرسول کلاّ شریف، بڑودہ، گجرات، ہند
(11) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۸۰
(12) کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۸۰
(13) ایضاً
(14) کلیات اکبرالہ آبادی، ح ۲، سید اکبر حسین، اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد ۱۹۲۶ء، ص ۲٦
(15) کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۸۰
(16) کلیات اکبرالہ آبادی، احمد محفوظ، ج ا، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی ۲۰۰۲ء، ص ٦۰۸
(17) کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۰
(18) ایضاً ص ۹۲
(19) ایضاً ص ۱۰۰٦
(20) کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی، خزینہ علم وادب لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۵
(21) فوائد الفواد، سید امیر حسن سنجری دہلوی، اردو مترجم خواجہ حسن ثانی نظامی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۸۴
(22) جانشین آستانہ فیض الرسول کلاّ شریف، بڑودہ، گجرات، ہند
(23) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۸۰
(24) کلیات اکبر، سید اکبر حسین اسٹینڈرڈ پریس الہ آباد، ۱۹۰۸ء، ص ۲۴
(25) کلیات اکبرالہ آبادی، سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۸
(26) ایضاً ص ٦۵
(27) اقبال نامہ، ج دوم، شیخ عطا اللہ، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷۵
(28)) ایضاً ص ۳۷۲
(29) ایضاً ص ۳۷٦

(30)اقبال سب کے لیے،فرمان فتح پوری، اردو اکیڈمی سندھ،۱۹۷۸ء،ص ۳۵
(31)اقبال نامہ، چراغ حسن حسرت تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور،۲۰۱۳ء،ص ۸۵تا۸۶
(32))کلیات اکبرالہ آبادی،سید اکبر حسین رضوی،خزینہ علم وادب لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۴۷۷
(33)کلیات اکبرالہ آبادی،سید اکبر حسین رضوی،خزینہ علم وادب لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۴۳۳
(34)کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۴۰۸
(35)کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۵۱۰
(36)کلیات اکبرالہ آبادی،سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی،۱۹۸۰ء،ص ۳۸۷
(37)کلیات اکبرالہ آبادی،سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی،۱۹۸۰ء،ص ۳۳۰
(38)کلیات اکبرالہ آبادی سید اکبر حسین رضوی خزینہ علم وادب لاہور،۲۰۱۰ء،ص ۸۰
(39)کلیات اکبرالہ آبادی، ح ۲،سید اکبر حسین،اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد،۱۹۲۶ء،ص ۲۹
(40)کلیات اکبرالہ آبادی،سید اکبر حسین، ہندوستان لیتھو پریس دہلی،۱۹۸۰ء،ص ۲۰۹
(41)کلیات اکبرالہ آبادی، ح ۲،سید اکبر حسین،اسٹار الکٹرک پرنٹنگ ورکس الہ آباد،۱۹۲۶ء،ص ۲۹

اکبرالہ آبادی کی شاعری میں اصلاحی عناصر

کسی شخص کا شاعر یا ادیب ہوجانا کوئی کمال نہیں۔شخصیت وہی اعلیٰ کہلاتی ہے جو اپنے کردار،حسن اخلاق کی وجہ سے دوسروں کو متاثر کرے۔ادب کی دنیا میں ایسی بے شمار شخصیات گزری ہیں جنہوں نے اپنے کردار سے معاشرہ میں انقلاب برپا کیا۔قوم کو خواب غفلت سے جگایا،انہیں ذہنی زنجیروں سے آزاد کرایا۔ان میں اکبرالہ آبادی کا نام قابل ذکر ہے۔اکبرالہ آبادی کو صرف شاعر کہہ کر موسوم کرنا ان کی شخصیت سے ناانصافی ہے۔اکبر بلا شک وشبہ ایک غیر معمولی شاعر تھے۔ساتھ ہی قوم کا درد رکھنے والے ایک مسیحا بھی تھے۔اکبر نے اپنی شاعری کو تبلیغ کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ معاشرے کی اصلاح کے لیے استعمال کیا۔اپنی شاعری خاص کر نظموں کے ذریعہ مردہ دلوں میں جان ڈالنے کا اہم کارنامہ انہوں نے کر دکھایا۔اکبر کی نظمیں اخلاق و محبت اور ایثار و ہمدردی کے جذبے سے ہم آہنگ ہیں۔انہوں نے ہمیشہ حق کی حمایت میں آواز بلند کی اور ایسا دلنشین انداز اختیار کیا کہ ان کا ہر شعر دل میں اترتا چلا گیا۔ان کا کلام حسن تخیل اور پختگی فن کے لحاظ سے لاجواب ہے۔اشعار کے ذریعہ قوم کی بے حسی کو دور کر کے ان کے اندر احساس کو بیدار کیا۔زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے اکبر نے متاثر نہ کیا ہو۔مذہب تعلیم،اخلاق،سیاست پر ان کی گہری نظر تھی۔شخصی لحاظ سے بھی وہ اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے شاعر کی حیثیت سے تھے۔خالص ادبیت کے لحاظ سے اکبر کی شاعری کا جائزہ لیں تو ان کی قادرالکلامی،طرز بیان کے باعث انہیں استادوں کی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ان کی عظمت کا انحصار محض ان کے فنی کمالات پر نہیں بلکہ زیادہ تر اس پر ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ایک عظیم مقصد کے لئے وقف کر دیا۔قدرت نے اکبر کو نہ صرف دوررس نگاہ اور فہم وفراست عطا کی تھی بلکہ ایک ایسا موثر ذریعہ اظہار بھی دیا تھا جو براہِ راست عوام کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔

اردو میں اکبرالہ آبادی کی انفرادیت اس لیے بھی ہے کہ انہوں نے اردو شاعری میں جتنی بے تکلفی برتی ہے،اس سے قبل کسی اور شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی۔جس موضوع کو انہوں نے چاہا اختیار کیا۔زبان و بیان کے معاملے میں انہوں نے کئی اہم تجربے کیے۔اکبر نے کبھی عوام کی زبان،کبھی صوفیوں اور کبھی شخص کی زبان اختیار کی۔ان کے طنز ومزاح کے متعلق بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔اکبر کے طنز ومزاح کا واحد مقصد صرف اور صرف اصلاح تھا۔تہذیب کے متعلق اکبر کا نظریہ حیات واضح کرتے ہوئے صغرا مہدی لکھتی ہیں:

> ''اکبر کا کہنا تھا کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی مذہب کو ماننا ضروری ہے۔ہر مذہب اچھا ہے اور وہ اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں اور شعروں میں مذہب کی اہمیت پر زور دیا اور لوگوں کے مذہب سے بیگانہ ہوجانے پر افسوس کیا ہے۔اکبر نے اپنی شاعری میں ان لوگوں کا بھی مذاق اُڑایا ہے جو انگریزوں کی اندھی تقلید کرنے میں لگے ہوئے تھے۔انہوں نے یہ بتایا کہ کسی قوم وتہذیب کی اچھی باتیں سیکھنا برا نہیں ہے۔مگر اپنے طور طریقوں کو بھول کر بس دوسروں کی نقل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ہماری تہذیب بہت پرانی ہے۔اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ہمیں اسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔''
>
> (اکبرالہ آبادی،صغرا مہدی،۱۹۸۳ دہلی،ص ۲۸)

اکبر نے ہمیشہ اسلامی تہذیب کا پاس ولحاظ رکھا اور مسلمانوں سے ہمیشہ یہی گزارش کی کہ وہ اپنی تابناک تہذیب وثقافت سے دستبردار نہ ہو۔تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ تعلیم کی ضرورت پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی۔اکبر کو قوم کی ذہنی آزادی کی بہت فکر تھی۔ہندوستان میں انگریزوں کے رائج کردہ تعلیمی نظام کے وہ سخت مخالف تھے۔اس نظام تعلیم کا مقصد ایک غیر مہذب قوم کو اس طرح مہذب بنانا تھا کہ وہ ہمیشہ ان کے غلام رہیں اور انہیں یہ احساس دلانا تھا کہ ان کے پاس نہ تعلیم ہے،نہ تہذیب ہے اور نہ ہی ان کا کوئی ماضی ہے۔اصل میں انگریز ہندوستانیوں کا ایسا گروہ آباد کرنا چاہتے تھے جو رنگ و خون میں ہندوستانی تو ہو لیکن اخلاق اور ذہن میں انگریزی ہو۔اکبر مغربی خیالات کی تازگی سے بخوبی واقت تھے اور اس کو خاصی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن انہیں یہ خطرہ بھی دکھائی دیتا تھا کہ جو قوم غیر ملکی اقتدار کی زد میں آ کر اپنی تاریخی عظمت،اپنی ثقافت،اپنے ادب اور تہذیب کو بھول جاتی ہے اس قوم کی روح بھی ختم ہوجاتی ہے۔مغرب کی جا بجا تقلید ونقالی اور خاص طور پر اسلامی مشرق کے محاسن سے بیزاری اکبر کے لیے اکثر تشویش کا باعث رہی۔ان کے بیشتر اشعار

ڈاکٹر شیخ عمران،اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو،وسنت راؤ نایک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز،مہاراشٹر

اس موضوع کے ارد گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ اشعار پیش ہیں:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے نا تمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسب و حال
پھر کیا امید دوست و آرام و احترام

اکبرالہ آبادی اردو کے ایسے شاعر تھے جن کی شاعری اپنے فکروفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ انہوں نے شاعری میں صرف کیا۔ ان کے کلام میں اس زمانہ کی ہر تحریک، اہم اشخاص اور معنی خیزہ واقعات کا عکس ملتا ہے۔ اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں اس طرح سماجی زندگی کی ایک روشن تصویر نہیں ملتی۔ اس لیے تہذیبی نقطہ نظر سے بھی اکبر اور ان کے کلام کی اہمیت ہے۔ اکبر کے ماہر اخلاق ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ ان کی شاعری محض آہ اور واہ کی روداد نہیں بلکہ انہوں نے شاعری کی بنیادیں اخلاق پر استوار کی ہیں۔ اس ضمن میں اکبر کہتے ہیں:

تہذیب کے خلاف ہے لائے جو راہ پر
اب شاعری وہ ہے جو اُبھارے گناہ پر

اکبر نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑنے کا بیڑا اُٹھایا اور تن من سے اس کام میں جُٹ گئے۔ اپنی شاعری کے ذریعہ ان عناصر کے خلاف نعرہ بلند کیا جو قوم کے لیے تباہ کن تھے۔ اکبر الہ آبادی ایک دین دار مسلمان تھے۔ اپنے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ قوم کی فلاح کا کام کرنے کی ضد نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ اس کی بازگشت ان کی شاعری میں بھی سنائی دی۔ اکبر کی ابتدائی شاعری عشق و عاشقی کے جذبات سے معمور دکھائی دیتی ہے لیکن بعد میں انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان کی ایسی شاعری سے لوگ لطف اندوز تو بہت ہورہے ہیں لیکن اس میں اصلاح کا پہلو کہیں نہیں ہے۔ اکبر کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ہماری شاعری ملک و قوم کے لیے سودمند ثابت ہونے کے بجائے ان کے ذہن کو پراگندہ کر کے بداخلاقی کو رواج دے رہی ہے۔ لہذا اکبر نے نظموں کی طرح اپنی غزلوں میں بھی ایک نیا انداز اختیار کیا جس سے قوم کو فائدہ ہوا۔ اصلاحی عناصر سے لبریز شاعری کو فروغ دیا۔

> ''اکبر کی شاعری کا بڑا مقصد قوم کو خودداری اور خوداعتمادی کا سبق سکھانا تھا۔ دوسروں کی تقلید وہ بھی کورانہ تقلید کی خامیاں بتا کر اس سے باز رکھنا تھا۔ وہ تہذیب جس کی نقل ترقی پسندی کی علامت بن گئی تھی، اس تہذیب کی خرابیوں اور کمزوریوں کا احساس دلانا تھا۔ غیر ملکی حکومت کے جبر و استبداد سے قوم کو باخبر کرنا تھا۔ اور اکبر اپنے مقاصد میں بلاشبہ کامیاب ہوئے۔ اکبر چونکہ ایک حسّاس اور جذباتی شاعر تھے۔ وہ اپنے تصورات اور نظریات اس طرح نہ مرتب کر سکے جس کی تطبیق نئے زمانے پر ہوسکی۔''
>
> (اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، صغرا مہدی، ۱۹۸۱ دہلی، ص ۲۸۷)

یہ صحیح ہے کہ اکبر کی غزلوں کے مقابلے میں ان کی نظموں کا سرمایہ کم ہے، باوجود اس کے اکبر کی تمام نظموں میں اصلاحی پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ان کی تمام نظمیں قابل قدر اور لازوال ہیں اور اردو کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان نظموں میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اکبر نے نظموں کو چند موضوعات تک محدود نہیں رکھا۔ انسانی زندگی سے جڑے بہت سے مسائل کو شاعری میں اُٹھایا۔ نئی تہذیب کے کیا نقصانات ہیں، انسانی تہذیب کے مٹنے کے کیا نتائج سامنے آرہے ہیں اس کا بیان اپنی متعدد نظموں میں کیا۔ بے پردگی اور آزادی نسواں کا تذکرہ ان کی بیشتر نظموں میں شامل ہے۔ اکبر کی نظموں کے حوالے سے ان کی شخصیت اور شاعری کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ نظم ''قومی حسب فرمائش نواب الملک دربار'' اکبر کی ایک شاہکار نظم ہے۔ اس میں انہوں نے راست مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ماضی کو فراموش نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ ماضی کی یادیں تازہ کرتے ہوئے انہیں بیداری کا پیغام بھی دیا ہے۔ اشعار

پیش ہیں:

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ یہ ناحق پرستی تھی
طبعیت پر نہ دیو نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بد گمانی تھی نہ ہمت میں یہ پستی تھی
نظر میں مظہر نور حقیقت میں ساری ہستی تھی
تمہاری وضع دلکش تھی تمہاری شان عالی تھی
خوش اخلاق تمہاری مظہر شان جمالی تھی
وہ باتیں جن سے قومیں ہورہی نامور سیکھو
اُٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

ان اشعار کے ذریعہ اکبر نے مسلمانوں کے جذبات کو جگانے کے ساتھ انہیں بیداری کا پیغام دیا ہے۔مسلمانوں کی پستی کی وجوہات کو بیان کرتے ہوئے انہیں پستی سے باہر آنے کی تدابیر بھی بتائی ہے۔ڈاکٹر ظفر افصح اکبر کی نظم نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''اکبر کی تمام نظموں میں موضوعات کی ایک دنیا آباد ہے۔ان نظموں میں خالص سنجیدگی بھی ہے اور طنز وظرافت کی چاشنی اور ترشی بھی۔ان نظموں سے اکبر کے ذہن کو خوب اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔اکبر نے اپنی نظموں میں گہری سے گہری تہیں پیش کی ہیں اور سطحی سے سطحی موضوعات کو بھی منظوم کردیا ہے۔۔۔عام طور پر ان کی نظموں میں موضوع کی مرکزیت ہونے کے باوجود غزلیت کے زیر اثر تقابل اور تنوع سے تسلسل قائم کرنے کی کوشش ملتی ہے۔اور ارتقائے خیال میں ایک میکانیکی عمل درایت کر جاتا ہے۔اس سے ہوتا یہ ہے کہ نظم کا مرکزی خیال تو قاری کے ذہن میں جگہ بنالیتا ہے۔مگر ساتھ ہی ساتھ تقابل وتکرار سے کئی کئی رنگ دماغ میں جم جاتے ہیں۔فنی لحاظ ایسی نظموں میں طوالت کی گنجائش رہنے کے باوجود نظم نگار کی ذہنی تساہلی سامنے آجاتی ہے۔''

(اکبرالہ آبادی، ایک سماجی وسیاسی مطالعہ، ڈاکٹر ظفر افصح،ص۔۲۰۲)

اکبر کی نظموں میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن کی بنیاد پر نظم کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے۔''نصیحت اخلاق'' ان کی ایک بہترین نظم ہے۔اخلاق کا معیار کیا ہونا چاہیے یہ بتانے کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے چند اخلاقی نصیحتیں بھی کی ہیں۔اشعار ملاحظہ ہوں:

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا نور تو دل کا سرور ہے
گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے
البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پہ برائی سے دور ہے

افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے معین ہے اہل شعور ہے

جن مقاصد کے تحت اکبر نے شاعری کے دامن کو تھاما تھا اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔عورتوں کی تعلیم کا معاملہ ہر دور میں اُٹھایا گیا ہے،اکبر بھی اس کی زد میں آ گئے۔انہوں نے سرسید کی مخالفت اس لیے کی تھی کہ سرسید مغربی تہذیب کے قائل تھے۔مغربی تعلیم کی جانب سرسید کا جھکاؤ زیادہ تھا۔یہی بات اکبر کو ناگوار تھی۔اکبر کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم سے عورت بے پردگی کا شکار ہوگی،اپنی تہذیب و ثقافت سے دور ہو جائے گی،اپنے ماضی کو فراموش کر دے گی،مغربی تعلیم کے اسی ڈر نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔وہ یہ قطعی نہیں چاہتے تھے کہ ملک کی عورتیں بے پردہ رہیں۔انہوں نے ہمیشہ عورتوں کے لیے ایسی تعلیم کی حمایت کی جس میں مذہب کا عمل دخل ہو،حفظان صحت کے اصولوں سے واقفیت دی جائے،حساب کتاب،اخلاقی سبق آموز کتابوں سے ان کو بہرہ ور کیا جائے،جو مستقبل میں ان کی اولاد کی تعلیم اور تربیت میں معاون ثابت ہو سکے۔اس ضمن میں اشعار پیش ہیں:

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے
حُسن معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بے شک قصور ہے
اُن پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بندوبست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست
لیکن ضروری ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
آج اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا کل خراب

ان اشعار کی روشنی میں اکبر کے تعلیمی نظریات کا تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اکبر نہ نئی تعلیم کے خلاف تھے،نہ عورتوں کی تعلیم کے ان متعلق کا منشا صرف یہ تھا کہ نئی تعلیم مذہبیت اور تہذیب کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔دور حاضر میں جو حادثات رونما ہو رہے ہیں اس سے یہ واضح ہوتا ہے آج ان کی شاعری صحیح ثابت ہو رہی ہے۔تعلیم نسواں کے متعلق اکبر کے خیالات کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ان اشعار میں بڑے کام کی باتیں انہوں نے کہی ہیں۔اکبر نے اپنی شاعری کے حوالے سے سماجی برائیوں،مغربی تہذیب اور لادنیت کو طنز و مزاح کے پیکر میں ڈھال کر تنقید کا نشانہ بنایا۔اردو میں اصلاح معاشرہ کے ضمن میں سرسید،نذیر احمد،حالی،اقبال وغیرہ کو فوقیت حاصل ہے۔اکبر نے بھی اسی روایت کو جاری رکھا اور اسی روش پر وہ دکھائی دیے۔اشعار ملاحظہ ہوں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر الہ آبادی کی شاعری کو اگر الگ رخ سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ یہ بھی ایک ایسے ہی مجروح انسان کی پکار ہے جس کی شخصیت ہر حلیہ بہانے سے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کی سعی کر رہی ہے۔ان کے یہاں مغرب کی تہذیب اور اس کے دوسرے مظاہر کے بارے میں جو ایک تضحیک آمیز روّیہ ملتا ہے وہ اسی مجروح

شخصیت کی آواز ہے۔ ''نئی تہذیب'' اکبر کی ایک مشہور نظم ہے جس میں انہوں نے آنے والے زمانے کی تہذیب و معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔اس ن

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب کم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اکبر کی شاعری کا جس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اس قدر اس کی خصوصیات سامنے آتی ہیں اور ان کے امتیازات کا پتہ چلتا ہے۔سماج کے تلخ حقائق کو انہوں نے اپنی شاعری میں بھر پور انداز میں نظم کیا ہے۔اکبر نے اپنی شاعری میں اپنے عہد میں پھیلی ہوئی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ایسے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی جن کا راست تعلق عوام سے ہے۔الغرض اکبر کی پوری شاعری خاص کر نظموں میں اصلاح مرکزی خیال کی حیثیت رکھتا ہے۔اپنی نظمیہ شاعری میں انہوں نے مسلمانوں کو ان کا مقام و منصب یاد دلا کر ان کو زوال سے عروج،پستی سے بلندی کی طرف،تاریکی سے روشنی کی طرف،حال بد سے روشن مستقبل کی طرف لانے کی کوشش کی ہے۔ان کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اصلاحی عنصر کا اس میں بڑا عمل دخل ہے۔آج شدت سے اکبر کی نظموں کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔آج بھی ان کی شاعری ہمارے لیے رہبری و رہنمائی کا موثر ذریعہ ثابت ہو رہی ہے۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کی فنی وادبی خصوصیات

اکبرالہ آبادی اُردو ادب کے ایک اہم شاعر تھے۔ادبی زندگی کا آغاز غزل سے کیا ان کی شاعری کثیر پہلو کی حامل ہے جیسے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی وغیرہ۔شاعری کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان کی لغت میں زبردست اضافہ کیا۔اُن کے یہاں ایسے الفاظ و محاورات کا استعمال ملتا ہے جو صرف عام بول چال میں استعمال ہوتے تھے علمی وادبی محفلوں میں متروک تھے۔تاریخ گواہ ہے کہ جس زمانے میں اکبرالہ آبادی کی شاعری پروان چڑھی وہ ہر لحاظ سے بحرانی دور تھا سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں یہ ہی تغیرات ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ابتدا میں ضرور روایتی شاعری کی لیکن ان کا دل بہت جلد اس سے اکتا گیا وہ ایسی شاعری کے حامل تھے جو ان کے نظریات وخیالات کی ترجمانی کرے جس سے ملک وقوم کی اصلاح ہو۔انھوں نے ابتداء میں اپنے خیالات کو’’اودھ پنچ‘‘ کے ذریعے عوام تک پہنچانے میں نمایاں رول ادا کیا۔

شاعری کے لئے تخیل کے ساتھ ساتھ فن شاعری سے بھی آگاہی لازم ہے ساتھ ہی ساتھ زبان پر عبور ہونا بھی ضروری ہے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ،

’’بہترین صاحب فن وہ ہے جو معنی وصورت میں بہترین طریقے پر ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔جب یہ ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے تو اُس وقت صورت و معنی اس طرح آپس میں پیوست ہوجاتے ہیں کہ یہ بتانا سخت مشکل ہوجاتا ہے کہ کون سا حصہ معنی کا ہے اور کون سا صورت کا‘‘(فلسفہ جمال، ریاض الحسن۔ص۔47)

اکبرالہ آبادی کے کلام میں تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں اور ترکیبوں کا بیان بھی ملتا ہے۔زبان کی صفائی۔ گھلاوٹ اور مکالماتی انداز نمایاں خصوصیات ہیں جن میں بلا کی برجستگی ہے۔

چنانچہ چند اشعار ملاحظہ ہوں،

جب کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کر کہنے لگے اور آپ کو آتا ہے کیا
میں نے حالِ دل تمام شب ان سے کہا کیا
ہنگام صبح کہنے لگے کس ادا سے کیا
پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا
ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

اگرچہ یہ اشعار ہمیں داغ کی یاد دلاتے ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے زمانے کے رنگ اور اپنی طبیعت سے مجبور ہوکر منفرد راستہ اختیار کیا اور شاعری کو ایک نیا رنگ دیا۔انھوں نے غزل کے موضوعات کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی اہم تبدیلیاں لائیں اس بات کو ملحوظ رکھا کہ غزل کی ایمائیت اور رمزیت باقی رہے۔اکبر کی شاعری میں ایسی مسلسل غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر،

تو وضع پر اپنی قائم رہ قدرت کی تحقیر نہ کر
وے پائے نظر کو آزادی خود بنی کو زنجیر نہ کر
تو جاں میں مل اور آگ میں جل جب خشت سے کام ہے
ان کے خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

اکبرالہ آبادی کی بیشتر غزلیں ملتی ہیں جن میں خیالات کو پوری چستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے جیسے نہایت حسین ترکیبوں

ڈاکٹر شاہدہ نواز، صدر شعبہ اُردو، ڈگری کالج نوشہرہ (راجوری، جموں وکشمیر)

کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہوگیا، چہلم اُس کا
پا نیر لکھتا ہے کہ بیمار کا حال اچھا ہے
یوسف کو نہ سمجھے کہ جواں بھی ہے حسین بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی
ہم ہوں جو کلکٹر تو وہ ہو جائیں کمشنر
ہم ان سے کبھی عہدہ برآ ہو نہیں سکتے

انھوں نے غزل کے موضوعات کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔اُن کے ہا کلام میں دوطرح کی غزلیں ملتی ہیں وہ غزلیں جو خالص روایتی تھیں جن میں زبان کی خوبی کے ساتھ ساتھ حد درجے کا تغزل بھی موجود تھا وہیں دوسری جانب ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جو اپنے انداز بیاں، الفاظ اور موضوع کے لحاظ سے نئی تھیں۔

غزل کے ساتھ ساتھ اُردو نظم میں بھی انھوں نے اپنا راستہ الگ نکالا - اُردو نظم کی دنیا میں بھی اکبرالہ آبادی مشہور و مقبول رہے ہیں اُن کی پہلی مشہور نظم ''اودھ پنچ'' ہے جو کہ مثنوی کی بحر میں ہے اس میں فارسی تراکیب کا استعمال جا بجا کیا گیا ہے۔ابتدائی نظم ہونے کی وجہ سے شاید بہت دقیق الفاظ ملتے ہیں لیکن بعد کی نظموں میں یہ خامی نہیں ہے۔انھوں نے سنجیدہ اور فکر انگیز موضوع پر بھی نظمیں لکھی ہیں جیسے ''تعلیم نسواں'' بحث میں انور نے اکبر سے کہا ''ایک بوڑھا نحیف وخستہ دار''،''برق کلیسا''،''جلوۂ دربار دہلی''،''دریا کی روانی'' دوتتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں'' وغیرہ۔موضوع کے مطابق اندازِ بیاں بھی اختیار کیا گیا ہے۔''دوتتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں'' ایسی نظم ہے جسے پڑھ کر نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے۔یہ زبان کے اعتبار سے بہترین نظم ہے۔تراکیب بھی آسان ہے اسے رباعی کی بحر میں لکھا گیا ہے۔پروفیسر کلیم الدین احمد نظم کی تعریف یوں کرتے ہیں،

''کس سادگی، صفائی اور پاکیزگی سے تتریوں کے ناچ کی تصویر کھینچی ہے۔ یہ تصویر رسمی نہیں ہے۔اکبر اس نظم سے متاثر ہوئے اسی لئے یہ تصویر ایسی حسین و موثر ہے''۔

(جدید نظم اُردو اور یورپی اثرات، حامدی کاشمیری۔ص ۹۱)

''برق کلیسا'' میں طنزیہ انداز میں مسلمانوں کی ابتری اور مذہب سے دوری کی کیفیت بیان کی ہے۔اشعار میں روانی کے ساتھ ساتھ بلا کی برجستگی پائی جاتی ہے۔چنانچہ حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں،

''اس نظم میں تخلیقی تجربے کا ایک مکمل نقشہ کھینچا گیا ہے۔مکالماتی انداز نے اس نظم کو ڈرامائی حرکت عطا کی ہے۔نظم آغاز، وسط اور اختتام رکھتی ہے اور نظم کی شوخی وظرافت کے پیچھے اکبر نے مسلمانوں کے تنزل اور زوال کی جو تصویر پیش کی ہے اثر کیے بغیر نہیں رہتا''۔

(جدید نظم اُردو اور یورپی اثرات۔حامدی کاشمیری۔ص۔۱۶۰)

''جلوۂ دربار دہلی'' بھی اکبرالہ آبادی کی مشہور و معروف نظم ہے۔نظم میں دہلی دربار کی شان وشوکت کی بھرپور تصویر پیش کی ہے۔سادہ الفاظ، آسان ترکیب اور عام فہیم تشبیہات نمایاں خصوصیات ہیں۔پانی کی روانی کو دکھانے کے لئے طرح طرح کی تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔پانی کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے جیسے عاشق جانباز، فوج کا جوشیلا سپاہی، رقص کرتی ہوئی رقاصہ تو کہیں شریر اور چنچل بچہ

ادھر اور لچکتا پھولتا ہوا
رخ اس سمت کرتا پھسلتا ہوا

پہاڑوں سے سر کو پٹکتا ہوا
چٹانوں میں دامن جھکتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا
وہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا
تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا

نظم کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اکبر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ایسا لگتا ہے کہ الفاظ سپاہیوں کی طرح اُن کے سامنے موجود ہوتے ہیں جن کو وہ بحسن وخوبی استعمال کرتے ہیں جس کی بہترین مثال یہ نظم ہے جس میں پانی کی روانی کو خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نظم کے متعلق یوں لکھتے ہیں،

''حضرت اکبر نے الفاظ کے آہنگ سے دریا کی روانی،اس کے بڑھتے ہوئے جوش،غیض وغضب کا سماں باندھ دیا ہے''

(نظیر اکبرآبادی اوران کا عہد۔ص۔52)

کلیم الدین احمد اُردو ادب میں بت شکن کے نام سے جانے جاتے ہیں ہر ایک چیز کو مغربی عینک سے دیکھتے تھے شاید اسی وجہ سے نظم کے متعلق یوں لکھتے ہیں،

''نظم کے مفہوم سے واقف ہونے اور اس بات میں مغرب سے کچھ سیکھتے تو ان کی شاعری کی زیادہ اہمیت ہوجاتی لیکن عام شاعری کی طرح وہ غزل گوئی کے عادی ہوچکے تھے اس لئے نظم کے فرائض انجام نہ دے سکے۔بہر کیف دو تین نظمیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر اس طرف توجہ کرتے تو اور ریزہ خیالی سے بچنے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہوتے''(اُردو شاعری پر ایک نظر۔ص۔49)

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکبرالہ آبادی نے جدید نظم کے سلسلے میں وہ کوشش نہیں کی جو حالؔی اور آزؔاد نے کی البتہ ان کی نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شاعری میں ہونے والے تمام تجربات واصلاحات سے متفق تھے اُن کا مقصد شاعری سے قوم کی فلاح و بہبود کرنا تھا انہیں اپنے مشن میں کامیاب ہونے کے لئے نئے سانچوں کی ضرورت پڑی اسی لئے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نہ صرف جدید نظم کا سہارا لیا بلکہ بلا قافیہ نظمیں کہنے کا تجربہ بھی کیا۔

''چلا جاتا ہے ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر''مکمل طور پر بلینک ورس ہے۔زبان کے لحاظ سے بھی یہ مشہور ہے۔صاف اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔دس اشعار پر مشتمل نظم کا موضوع دنیا کی بے ثباتی ہے۔

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا مقصد ضرورت میں نے اُٹھایا اس کو انگلی پر
مگر ایسا وہ نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر لگا اسکا

اکبرالہ آبادی کے ہاں مختصر نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ان میں کبھی سنجیدہ تو کبھی مزاحیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اپنے عہد کے اہم واقعات اور مسائل پر اظہار خیال کرتے ہیں۔مختصر نظموں کا آغاز دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عنوان چشتی یوں کہتے ہیں،

''اُردو میں دوسری جنگ عظیم کے بعد مختصر نظموں کا وجود ہوا۔سید سجاد حیدر یلدرم کی مختصر نظم''شملہ کا ریلوے اسٹیشن پر ایک نظارہ'' اولین مختصر نظم ہے جو 1966ء میں منظر عام پر آئی''

(اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے۔ص۔225)

ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے باضابطہ فکروفن پر اظہار نہیں کیا ان کے خیالات اکثر ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتے ہیں اتنا ہی نہیں کچھ نظریات ان کے خطوط اور نثری تحریروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں حسن کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ فن صوری ومعنوی نقطہ نظر واضح ہو۔ چنانچہ کلیم الدین احمد شاعر کی تعریف یوں کرتے ہیں،

''شاعر ہم آپ جیسا تو انسان ضرور ہے لیکن کچھ غیر معمولی قسم کا۔ بے حسی سے اس کا دور کا واسطہ نہیں وہ کسی حساس آلے کی طرح گھر گھرا تا رہتا ہے اور ہونے والے واقعات پر برابر اثر ڈالتے رہتے ہیں''

(اُردو شاعری پر ایک نظر۔ ص۔13)

اکبرالہ آبادی کے اشعار فکر وخیال کی بلندی وعظمت سے بھر پور ہیں وہ فطری شاعری کے قائل تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ فطری شاعری کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں،

ایک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے
ایک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے

جہاں ایک طرف وہ فکر ومعنی کے قائل تھے وہیں دوسری جانب اسلوب کی اہمیت کے قائل بھی نظر آتے ہیں۔ روشن بیانی اُنہیں کافی پسند ہے۔

آفریں اکبر بریں روشن بیانی ہائے تو
شعرخوانی وی تابدبہ محفل آفتاب

اکبرالہ آبادی کو حسن ومعنی پر گہرا عبور حاصل تھا۔ وہ لفظ ومعنی کی حدود سے واقف تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں،

معنی کی شعاؤں سے جو لکھ جاتا ہے اکبر
سچ یہ ہے کہ وہ لفظوں میں بیان ہو نہیں سکتا

وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ اعلیٰ شاعری اپنی صداؤں کا آپ نمائندہ ہوتی ہے۔ ذیل شعر میں لفظ ومعنی کا جدید تصور موجود ہے۔

معنی کو ضرورت نہیں الفاظ کی اکبر
اب سب جانتے ہیں حسن صدا بھی ہے کوئی چیز

علاوہ ازیں ان کے یہاں جدت، نئے پن، مطالعہ فطرت، خلوص اور سچائی کا استعمال بھر پور ملتا ہے۔ وہ خواب خیال کی شاعری سے پرہیز کرتے نظر آتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاعر کو ماہر علم ارضی سے زیادہ علم النفس کا راز داں ہونا چاہیے۔ ظاہری بات ہے کہ دل کی دُنیا کو بغیر لگن، عشق ومحبت کے سمجھنا ممکن نہیں۔ عشق ایک ایسا لازوال جذبہ ہوتا ہے جو دل کو متحرک اور فعال کر کے کون ومکان کے رمز شناس بنا دیتا ہے وہیں دوسری جانب دیکھا جائے تو علم وعقل کی مجبوری کا بھر پور احساس ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی

عشق ودل کی وضاحت اُن کی نثر میں بھی بھر پور طریقے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ انہیں سماجی شعور کا احساس شدت سے تھا۔ ایک مصلح کی طرح نہیں بلکہ ایک عاشق کی طرح اُن کا کہنا ہے کہ سماجی شعور کے علم میں زبان ایسی استعمال کی جانی چاہیئے جو بیک وقت قابل فہم بھی ہو۔ اور ساتھ ساتھ دل کو بھی چھو سکے۔ وہ کہتے ہیں،

مجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ کر منتخب سمجھیں
بیان ایسا کہ دل مانے زبان ایسی کہ سب سمجھیں

جہاں انھوں نے سماجی شعور کا ذکر کیا ہے وہیں وہ اس سلسلے میں ذاتی مفاد پرستی کو دُور رکھنے کی بات بھی کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاعر جب ذاتی مفاد کوملحوظ رکھتا ہے تو شاعری بے جان ہو جاتی ہے اور معانی گم ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں،

طلب زر ہے جن کو اے اکبرؔ
وہ رہیں منگر خزانۂ غیب

اکبرالہ آبادی کو کبھی فرد سے جھگڑا نہیں تھا انھوں نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا اُن کی ذاتی زندگی کا رکھ رکھاؤ بھی کچھ ایسا تھا کہ کسی سے نفرت کی شکایت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں مغرب کی تہذیب سے نفرت تھی تعلیم سے نہیں۔ وہ مزاحیہ وطنزیہ انداز میں مصر کی تہذیب کے متعلق بات کیا کرتے تھے۔

چنانچہ کلیم الدین احمد یوں بیان کرتے ہیں،

''موضوع مزاحیہ سہی لیکن اگر ادیب نے موضوع پر بحث کرنے میں صنعت کارانہ سنجیدگی سے کام لیا تو پڑھنے والا بھی اسے سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ موضوع ہے سنجیدہ یا غیر سنجیدہ ہو سکتا ہے لیکن آرٹ ہمیشہ سنجیدہ ہوتا ہے''

(سخن ہائے گفتنی، کلیم الدین احمد، ص۔192-191)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اُردو شاعری میں طنز وظرافت اور ہجو کے عناصر شروع سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ غلام احمد کاکوروی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں،

''اُردو نثر ونظم میں اگر طنز ومزاح کا تاریخی حیثیت سے تجزیہ کیا جائے تو ہم پورے ادب کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اُردو میں پہلا دور جعفر زٹلی سے شروع ہو کر سودا پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور جو غدر کے بعد کا دور ہے اس میں نثر ونظم کی شوخی وظرافت کی دستار اسداللہ خان غالبؔ کے چہرے پر بھلی لگتی ہے۔ تیسرا دور اا کبرالہ آبادی سے شروع ہوتا ہے جو اودھ پنچ کے ایڈیٹر سجاد حسین مرحوم کی سرکردگی میں پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا بیگ، نواب محمد سید آزاد شہباز، منشی جولا پرشاد برق، اکبرالہ آبادی، منشی احمد علی شوق اور مولوی احمد علی کس منڈوی نے اخبار کے ذریعے ادب اور انشا کے پھول کھلائے۔ چوتھا دور جس میں دور حاضرہ بھی شامل ہے جسے قدیم وجدید کے درمیان کی کڑی کہا جاتا ہے۔ اس دور کے ابتدائی لکھنے والوں میں محفوظ علی بدایوانی، سلطان حیدر جوش اور مولانا ظفر علی خان جو قدامت کے پرستار ہیں اور میخانہ علی گڑھ کے میخوار ہیں اس دور کے آخری مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ ہیں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ملا رموزی اور کنہیالال کپور ہیں'' (اردو ادب میں طنز ومزاح۔ ص۔28، 29)

اکبرالہ آبادی کی شاعری سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی تحقیقات میں حسن ومعنی اور حسن صورت کا حسین امتزاج قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے منفرد اسلوب کا انداز، طنز وظرافت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اکبر غدر کے بعد کی پیداوار ہیں ان کے کلام میں اس کے متعلق بھی جانکاری ملتی ہے آپ نے اپنی شاعری کے ادوار خود قائم کئے، ابتداء میں ان کے ہاں رومان پسندی دیکھنے کو ملتی ہے جس کا اندازہ ان کے ابتدائی دور کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

جانب زنجیر گیسو پھر کھنچا جاتا ہے دِل
دیکھئے اب میرے سر پر کیا بلا لاتا ہے دِل

لوگ کیونکر چھوڑ دیتے ہیں محبت دفعتاً
میں تو جب یہ قصد کرتا ہوں مچل جاتا ہے دل

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ان کی شاعری بڑھتی گئی تو انکے ہاں صوفیانہ اصلاح بھی دیکھنے کوملتی ہے،

اہل ِدل کو ذکر قمری سے یہ آتی ہے صدا
باغ دل میں چاہئے سر وقد دل جوئے دوست

اسی طرح طنزوظرافت جوکہ ان کی شاعری کی جان ہے۔شاعری کے آخری دور میں دیکھنے کوملتی ہے۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں،

جب آنا موت کا ممکن نہیں جنت میں اے واعظ
تو پھر کس کام کے حوروں کے وعدے باغ رضواں میں
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چر چا عام نہیں ہوتا

بقول پروفیسر احتشام حسین،

''1885ء سے انھوں نے باقاعدہ وہ ظریفانہ شاعری شروع کردی جوان کا سرمایۂ افتخار ہے''(تنقید وعملی تنقید۔ص۔132)

وہ اپنے گردنواح سے بخوبی واقف تھے اوراس پر گہری نظر رکھتے تھے وہ اپنی اندرونی دُنیا کی ہلچل سے بھی متاثر تھے۔طویل عمر پانے کی وجہ سے انھوں نے بہت سارے انقلاب دیکھے وہیں دوسری جانب داخلی دُنیا کے حادثات سے بھی دوچار ہوئے بغیرنہیں رہ سکے۔

مجموعی طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اکبرالہ آبادی نے مختلف اصناف پرطبع آزمائی کی جیسے غزل،نظم،رباعی،قطعے وغیرہ لیکن وہ غزلوں اورنظموں کی وجہ سے اُردوادب میں جانے جاتے ہیں۔غزل میں انھوں نے حروف تہجی کی روایت کو برقرار رکھا۔انھوں نے اپنے کلام میں بغیرکسی ہچکچاہٹ اور جھجک کے نئے رنگ و نئے لب و لہجے کوسمویا،طنزوظرافت اُن کے کلام کا اہم خاصہ ہے۔

فخر الہٰ باد اکبر الہٰ بادی

الہٰ باد اس معنی میں بہت خوش نصیب ہے کہ یہاں اکبر کا قلعہ ہے۔آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کا موروثی عالی شان گھر آنند بھون ،سوراج بھون کے نام سے مشہور ہے۔جواب تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔یہاں سے آزادی کی تحریک کو جلا ملی ۔اس وقت کے تمام سیاسی رہنماؤں کا مہمان خانہ تھا۔گاندھی جی کی آمد ورفت رہتی تھی جو کہ باالآخر آزادی کے پروانہ کی صورت ظہور میں آئی۔خسرو باغ کی اپنی شان وشوکت آج تک برقرار ہے۔مولوی لیاقت علی اور مجاہد آزادی یہاں اپنی خفیہ مجالس کرتے اور انگریزوں کو ناکوں چنے چبوانے کے منصوبوں میں کامیابی حاصل کرتے۔ الہٰ باد کی تروینی کے کیا کہنے! گنگا،جمنا کے دلفریب سنگم کے نظاروں کو کون بھلا سکتا ہے۔کمبھ کا میلا اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔لاکھوں کی تعداد میں ملک و بیرون ملک سے لوگ اپنے پاپ سے پاک ہونے آتے ہیں۔کلپ واس بھی کرتے ہیں۔مزید برآں یہاں کے امرود اپنی شیرینی اور خوبصورتی میں یکتا ہیں۔انھیں دیکھ کر سیب کو بھی پسینہ آجاتا ہے!اکبر الہٰ بادی خالص الہ بادی انداز میں کہتے ہیں:

کچھ الہٰ باد میں ساماں نہیں بہبود کے یاں دھرا کیا ہے فقط اکبر کے اور امرود کے غالبًا دوسرا پسندیدہ پھل غالب کی طرح آم ہے:

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے   اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے
معلوم ہی ہے آپ کو بندہ کا ایڈریس   سیدھے الہٰ باد میرے نام بھیجئے

اکبر الہٰ بادی کا مشن وہی تھا جو دیگر مصلحین قوم ،مجاہدین تحریک آزادی مولانا ابوالکلام آزاد ،پنڈت نہرو بابائے قوم گاندھی جی،سرسید ،حالی،آزاد ،مولانا محمد علی جوہر اور علی برادران وغیرہم کا تھا۔سب اپنی صلاحتوں کا استعمال صحافت،خطابت،شاعری اور مقالات سے کررہے تھے۔نئے زمانے کی کروٹوں کی آہٹوں کو آنے والے تہذیبی طوفان کا پیش خیمہ ہے،یہ بات باور کرانے کی کوشش کررہے تھے۔اکبر انگریزی گورنمنٹ میں سیشن جج تھے۔کچھ تو یہ حکمت پیش نظر تھی اور بہت کچھ ان کے اپنے مزاج ظریفانہ کا دخل تھا کہ وہ ہنسی،مذاق میں عوام کو اس طرح بیدار کرنا اور آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ بار خاطر بھی نہ ہو اور اپنی اصلاح خود کرنے کا داعیہ بھی پیدا ہوجائے۔اگرچہ یہ نہائت مشکل مرحلہ ہے لیکن ان کی مہارت مسلم الثبوت ہے ۔اس پایہ کا مصلح قوم پھر پیدا نہ ہوا۔اس کا اصل سبب تقویٰ تھا۔ان کو خوف تھا کہ دنیاوی تعلیم جو کہ صرف چندروزہ زندگی کو گزارنے کا ہنر ہے،اس میں ڈوب کر مسلمان آخرت سے غافل نہ ہوجائیں۔اس ناقابل تلافی خسارہ کا سودا کوئی دولت،عزت،حکومت ،شان وشوکت اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ نہیں کرسکتا!وہ اپنے سامنے مغربی تعلیم کی ہوڑ میں اسلامی تہذیب ومعاشرت جو نبی کریم ﷺ لائے تھے،پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔دل خون کے آنسو روتا تھا اور وہ یہ لٹتی ہوئی دولت پر یا تو ہاتھ ملتے تھے یا ہنسی میں کام کی بات کو شیرینی میں انڈیلتے تھے۔اگر فراق گورکھپوری کے الفاظ میں کہیں تو : اشکوں میں تیرتی ہوئی کچھ مسکراہٹیں'' کے کرب میں زندگی گزار رہے تھے۔افسوس اان کے تمام خدشات اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ان کی تنبیہ کو نظر انداز کرے ہماری نسلیں پروان چڑھتی جارہی ہیں۔اکبر مغربی تعلیم کے خلاف ہوتے تو قانون نہ پڑھتے ،فقہ پر اکتفا کرتے۔اپنے فرزند کو تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن نہ بھیجتے۔ان کا اصرار اس بات پر تھا:

تم شوق سے کالج میں پڑھو ،پارک میں کھیلو
جائز ہے غباروں پہ اُڑو ،چرخ کو چھو لو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبر الہٰ بادی ایک شریف النفس،سیدھے سادے انسان تھے۔ان کی شاعری میں ان کا عکس نمایاں ہے یہی سبب ہے کہ اپنی سادہ مزاجی اور پتہ کی باتوں نے ان کی شاعری کا لوہا اپنی زندگی میں ہی منوالیا تھا۔اس میں طنز ومزاح کی آمیزش کی چاشنی سیدھے دل ودماغ پر اثر کرتی ہے یا یوں کہے دل سے نکلتی

ڈاکٹر شہناز صبیح،(مجیب قدوائی) سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر،الہ باد ڈگری کالج الہ باد

ہےاور دل میں انی ہو جاتی ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ان دس پندرہ اشعار حلق سے اترتے ہی نفس اور ضمیر میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ نفس کی پرزور رسہّ کشی کے باوجود فتح ضمیر کی ہوتی ہے اور دل مطمئین ہو کر پرسکون ہو جاتا ہے۔

اکبرالہٰ بادی کی شاعری کی مقبولیت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی کہ ۱۹۳۶ء تک ان کی کلیاّت کے گیارہ اڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ ہمیں یہ کہنے کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ اس ہنسوڑ بابا کے زمانے سے دور ہوتے ہوتے ان کی تعلیمات اور خدشات کو قوم نے فراموش کرنے میں کوئی کسر نہیں اُ ٹھا رکھی! اس جدید تعلیم کی تمنا انھوں نے نہیں کی تھی۔ سچ کہوں تو وہ زندگی میں نزع کی اذیّت، قبر میں نکیرین کے سوالات و جوابات، عالم برزخ کی زندگی، پُل صراط کے سفر اور جہنم کے شعلوں کے خوف میں جیتے تھے اور اپنی اولاد کی طرح اپنی قوم کو اس تہذیب سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

اکبرالہٰ بادی زمینی حقیقتوں کے نباض تھے۔ زندگی کے مسائل، روزی روٹی کی فکر، ایک اچھے شہری کی زندگی کے خواب، عزت و ناموس کی حفاظت، مستورات کی عزت و آبرو کی حفاظت اور ان کی گودوں میں پرورش پانے والی نسل کی پاکیزگی اور اعلیٰ پرورش ان کے مقاصد زندگی تھے۔ تعلیم نسواں کے منکر کیسے ہو سکتے تھے کہ نسلوں کی پرورش آغوش مادر میں ہوتی ہے لیکن ایسی تعلیم جو سارے رشتہ، ناطوں سے دست بردار ہو جائے، تفریح محفل بن جائے ان کی حمیّت گوارہ نہیں کر سکتی تھی اور شرافت کا تقاضا بھی یہی تھا ہو سکتا ہے نئی نئی آزادی کے جوش میں خواتین کو ان کی مذاق کے پردے میں کی گئی تنبیہات شاق گزری ہوں:

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں ،
اکبر زمیں پہ غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

وہ خاتون خانہ کی مجلسوں میں بیبا کی پر انگشت بدنداں ہیں:

حا مدہ چمکی نہ تھی ،انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمع محفل ہے پہلے چراغ خانہ تھی

جب شاعر مشرق کی عورت، مغرب زدہ ہو کر اپنی ذ مّہ داریوں سے دستبردار ہوتی نظر آتی ہے، وہ تحمّل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مخاطب ہیں:

مجھ سے بیگم نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ فرمایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہی مشرقی ادب و لحاظ سے اپنے بڑوں خصوصاً شوہر سے بات کرنے کے تیور بد ل لیتی ہے تو ہندوستانی شوہروں کا مستقبل ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

اکبر ڈرا نہیں کسی حاکم کی فوج سے
لیکن وہ ڈر گیا بڑی بیگم کی نوج سے

اکبر کا یہی خاص موضوع نہیں ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں ،طنز و مزاح کا سماں بندھ جاتا ہے۔ مختصر کرتے کرتے بھی یہ خزانہ بڑھتا جاتا ہے: عشق و عاشقی نوجوانوں کی عمر کا عزیز سرمایہ ہوا کرتی ہے۔ اکبر بھی لیلیٰ، مجنوں کی آڑ میں پڑھائی سے جی چُرا کر فقط محبوبہ کو حاصل کرنے کی تمنا میں وقت برباد کرتے ہوئے عاشق سے مخاطب ہیں، جب غلامی میں قبول کرنے کی التجا لے کر مجنوں پہونچتے ہیں تو کیا عمدہ مکالمہ ہوتا ہے:

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ما ں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے بی۔اے۔ پاس

تو بیشک بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
میں بن جاؤں بلا کھٹکے تیری ساس

اب جواب ملاحظہ کریں:

یہ اچھی قدر دانی آ پ نے کی
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

اور پھر نکاح کی نوبت نہیں آتی ۔حسرت بن جاتی:

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو میرا استعفا ء با حسرت و یاس

پائپ اور ٹائپ اس عمر میں ان کے لیئے وبال بن گئے۔نالاں ہیں:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دُہائی ہے۔

اکبر کے عہد میں سیاسی سرگرمیاں روز نئے رنگ دکھاتی تھیں۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کون سا سرا پکڑیں کہ اس دوڑ میں شامل ہو جائیں۔دین و دنیا میں کامیابی کی کنجی تو علم کے پاس ہے،اس سے انکار ممکن نہیں۔سرسید بہت دور اندیش تھے اور اپنی قوم کے متعلق بے حد فکرمند! ان کے اس اضطراب کو قرار دیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے غیر معمولی کارنامہ نے۔اول اول اکبر کو یہ فیصلہ قابل قبول نہیں ہوا لیکن حالات کے پیش نظر قائل ہو گئے:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے
نہ بھولو فرق جو ہے کام کرنے ،کہنے والے میں۔

مہاتما گاندھی کی تحریک میں دل سے شامل ہیں لیکن مجبوری:

مد خولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اکبر کی انفرادیت اس میں ہے کہ وہ دلا آزاری کے قائل نہیں تھے لیکن جیتی آنکھوں مکھی بھی نہیں نگل سکتے تھے۔اپنی نسل کو شراب و کباب،ناچ رنگ کی محفلوں کی نذر ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔عفت مآب خواتین کو ہوسناک نگاہوں کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔یہ ان کے ایمان کا تقاضا تھا اس لیئے ان کو کڑوی،کسیلی باتوں کو طنز و مزاح کی شیرینی میں ڈبو کر کہنا پڑا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کی شاعری کے ذریعہ ایک صدی قبل جو زبان ہمارے ملک والوں کے لیئے قطعی انجان تھی ،ہماری شعری اور ادبی دنیا میں غیر محسوس طریقہ سے داخل ہو کر اردو زبان کے مزاج کے مطابق شیر وشکر ہو گئی اور اس کی چاشنی غیر معمولی لطف دے گئی۔ماہر لسانیات پروفیسر گیان چند جین نے اپنی تحقیق سے ثابت کر دیا کئی سو الفاظ انگریزی کے اردو میں اکبر کی شاعری کی وجہ سے در آئے اور اس کا حصہ بن گئے۔یہ فہرست بہت طویل ہے۔اس وجہ سے شامل کرنا حکمت کے خلاف ہے معدودے چند مستعمل الفاظ یہ ہیں کوٹ،بوٹ،پائپ،ٹائیپ،ڈریس،ڈانس،لیڈی،میم،مس گورنر،کس،مس

،وغیرہا ،صدہا۔ہوٹل،وہسکی،ڈگری،ڈاکٹر،ریل،ریلوے وغیرہ وغیرہ۔

الغرض اکبرالہٰ بادی کے یوم پیدائش کے موقع پران کوخراج عقیدت پیش کرنا ہمارا اخلاقی اورادبی فرض ہے۔دیگرمصلحین وقت کی طرح اکبرکا نظریہ خاص یہی تھا کہ ترقی کی راہ میں ہمارا قافلہ اسی وقت آگے بڑھ سکتا ہے جب:

''ہمارے داہنے ہاتھ میں فلسفہ،بائیں ہاتھ میں سائینس اورکلمہ لا الہٰ کا تاج سر پر ہوگا''

یہ وہ حقیقت ہے جس سے سرِ مُو انحراف کی گنجائش نہیں،یہ الگ بات ہے کہ مزاح کے پردے میں اکبرالہٰ بادی نے نیک کاموں کوکرنے اور بری باتوں سے روکنے کا اہم فرض اپنی شاعری کے ذریعہ ادا کیا ہے۔عقلمندوں کواشارہ کافی ہوتا ہے۔

''اور جو نہ سمجھے تو باتیں ہزار ہیں'۔اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطافرمائے۔آمین

سوانحی کوائف:

نام۔ سیداکبرحسین رضوی۔تخلص اکبر ولدیت سیدتفضّل حسین رضوی۔نائب تحصیلدار

ولادت ۱۶نومبر۱۸۴۶ء۔

ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں پائی۔محکمۂ تعمیرات میں نوکری ملی۔

مختاری کاامتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہوئے	۱۸۶۹ء
مسل خوانی کی جگہ ملی ہائی کورٹ میں	۱۸۷۰ء
وکالت کاامتحان پاس کیا	۱۸۷۲ء

وکالت کرتے رہے ۱۸۸۰ء پھر منصف مقرر ہوئے۔

عدالت خفیہ کے جج ہوئے	۱۸۹۴ء
خان بہادری کا خطاب ملا	۱۸۹۸ء
ملازمت سے سبکدوش ہوئے	۱۹۰۳ء
وفات ۷۵ برس کی عمر	۱۹۲۱ء

طنزیہ شاعری کا نقیب اکبرالہ آبادی

لسان العصر اکبرالہ آبادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں ان کوایک منفرد مقام حاصل ہےان کی شاعری پر گفتگوکرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سیاسی حالات،تہذیبی ومعاشرتی امتیازات کومختصراًبیان کر دیا جائے تا کہ ان عناصر کا اندازہ ہو سکے۔جوان کی شاعری کے اجزائے ترکیبی میں نمایاں ہیں۔

برصغیر کی تہذیبی اورفکری فضا پرنظر ڈالیں تومحسوس ہوگا کہ ہرمعاشرےاورتہذیب میں اصلاح وانقلاب کا رجحان عام ہے بیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان اصلاحی رجحان سے پہچانا جاتا ہے۔یہ عہدمختلف قوموں اور معاشروں کے تصادم کا دورتھا ہرقوم وملت کی قدیم روایتیں تیزی سے بدل رہی تھیں۔اس لئے طرح طرح کی برائیاں سماج میں پھیلی ہوئی تھیں۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے ہندوستانی معاشرے کواحساس محرومی،خوف ودہشت،احساسِ عجزوبے چارگی سے دوچار کر دیا تھا۔سبھی ہندوستانی قوموں کے سر برآوردہ افراد نے اپنے اپنے طور پراس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کیں اور بہترامکانات کی تلاش میں سرگرداں نظرآئے۔اس عہد کے مصلح اوردانشوردومتضادافکارونظریات میں منقسم نظرآتے ہیں ایک گروہ انگریزی تہذیب ومعاشرت کو ہرشعبۂ حیات میں بے چون وچراں قبول کررہا تھا اپنی تہذیبی قدروں کی پرواہ کئے بغیر ہندوستانی قوم کوانگریزی تہذیب وتمدن پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دے رہا تھا۔جبکہ بالمقابل افکارونظریات کے حامل افرادمغربی تہذیب وتمدن سےنفرت کا اظہار کر رہے تھے،قدیم تہذیبی روایت ان کواس قدرعزیزتھی کہ وہ اس سے ذرہ برابربھی روگردانی کرنے کوتیار نہ تھےاورنہ ہی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کوسماج کے لئے بہترسمجھتے تھے۔وزیرآغااس عہد کے رجحانات پراظہارخیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ دورمختلف رجحانات کے تصادم کا دورتھا تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کواپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایک ایسا اندرونی تموج پیدا ہوگیا تھا کہ ملک کا باشعورطبقہ اندھادھندمغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا مقلدبھی ہونے لگا تھاجذباتیت کی رواپنے عروج پرتھی ایک طرف وہ لوگ تھے جوکسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جواپنی روایت اورتہذیب کا دامن چھوڑنے پرآمادہ تھےان دونوں طبقوں کا اندازکسی نہ کسی حدتک جذباتی تھا۔''

(اردوادب میں طنزومزاح،ص ۱۰۸)

یہ دورسیاسی واقتصادی بحران اورسماجی واخلاقی اقدار میں انقلاب عظیم کا دور ہےاس کا لازمی نتیجہ ہمارے ادب کی بیشتراصناف میں طنزیہ لہجے کی صورت میں نمودار ہوا،اردو شاعری نے بالخصوص اثرات قبول کئے۔

طنزومزاح کا مقصدہنسی ہنسی میں لوگوں کومعاشرے کی برائیوں اورکمیوں سے بہرہ ورکرنا ہےاکبر کی شاعری کا بغورمطالعہ کیا جائے توان کے طنزومزاح کا مقصدبھی یہی قرار پاتا ہے۔اکبرنے طنزیہ شاعری کوتہذیب کا جامہ پہنا کرقبول خاص وعام بنادیا۔اس طرح جدیدطنزیہ شاعری کےنقیب کہلائے۔

اکبرنے حالات حاضرہ اورانسانی تہذیب وتمدن کے بےکراں موضوعات کواپنی شاعری کے ذریعے زبان بخشی۔اکبرکی شاعری کووسعت اورنکھاربخشنے میں اودھ کے اجراء نے اہم کردارادا کیا۔

اکبرمغربی تہذیب کےسخت مخالف تھے،وہ ہراس چیزکوطنزکانشانہ بناتے تھے جواس تہذیب کےفروغ میں مددومعاون ہو،سرسیداحمدخاں مسلمانوں کی زبوں حالی کے لئے جدیدعلوم سے دوری کوذمہ دار مانتے تھےان کا خیال تھا کہ جدیدعلوم وفنون سے بہرہ ورہوئے بغیرہم ترقی کی منزل طےہی نہیں کرسکتے ہیں۔اس کےحصول کے لئے انہوں نےعملی قدم بھی اٹھائےاورعلی گڑھ کی تحریک کی بنیادبھی ڈالی۔اس تحریک نےمسلمانوں کوجدیدعلوم کی طرف راغب کرنے کے لئے ہرممکن جدوجہدکی۔سماج کےایک بڑے طبقے کی طرف سےاس کی شدیدمخالفت کی گئی،اکبراس کےایک سرگرم رکن تھے۔عمل اوررد عمل کےنظریات نےاکبرکی شاعری کےایک بڑے حصےکووجودبخشا۔مندرجہ ذیل اشعاراس کے بین الثبوت ہیں:

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تونے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا اثر نہ رہا لاالہ کا
شیطان نے دکھا کے جمالِ عروس دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے حب جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

ڈاکٹرعبدالحفیظ،اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو،سدھارتھ یونیورسٹی کپل وستو،سدھارتھ نگر،یوپی

دوسری نظم میں یوں لکھتے ہیں:

بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں
بعض نمود و نام کے خواہاں
ہر دم قوم کا رونا کیا ہے
ان باتوں سے ہونا کیا ہے

ڈاکٹر شارب ردولوی اکبر اور سرسید کے نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اودھ پہنچے اور اس کے ساتھیوں نے علی گڑھ تحریک اور سرسید کی کھل کر مخالفت کی خوب خوب کیچڑ اچھالا، اکبرالہ آبادی نے مختلف ناموں سے سرسید، علی گڑھ تحریک اور جدید تعلیم کے بارے میں بہت سے شعر کہے اور سرسید کا مذاق اڑایا۔''

(جدید اردو تنقید اصول و نظریات، ص ۱۴۴)

اکبر نے اپنی شاعری میں ترقی و تہذیب کے غلط تصور پر وار کئے اور نئی تہذیب کی ترویج میں چوں کہ سرسید پیش پیش تھے اس لئے انھوں نے ان کو اور ان کی تحریک کو بھی اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔ ابتداً اکبر کو یہ غلط فہمی تھی کہ سرسید انگریزوں کی خوشامد کر رہے ہیں تا کہ ان کی نظر میں عزت و وقار حاصل کر سکیں لیکن جب سرسید سے ملاقات ہوئی، تبادلۂ خیال ہوا تو ان کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی مگر ان کی ترقی اور تہذیب کے تصور میں جو غلط اثرات مرتب ہو رہے تھے اکبر نے طنز و مزاح کے پیرائے میں تنقید کی۔ حالانکہ وہ سرسید کی تعمیری مثبت سوچ کے قائل ہو گئے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں جس میں اکبر کے دونوں مطمح نظر کا پتا چلتا ہے۔

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوز جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا
تدبیر بہت کی اے اکبر تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی
یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا سید کو مرید بنا ہی لیا
سب پیروں سے یہ بچ نکلے اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی
خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے شریف زادے
لطیف و خوش وضع، چست و چالاک و صاف پاکیزہ، شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے
کمالِ محنت سے پڑھ رہے ہیں، کمال غیرت سے پڑھ رہے ہیں
سوار مشرق کی راہ میں ہیں، تو مغربی راہ میں پیادے

....

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اکبر جدید تصورات و نظریات کی اندھی تقلید اور غلامانہ ذہنیت کے مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ غور و فکر کے بعد جو چیزیں ہماری قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہیں ان کو اعتدال کے ساتھ قبول کیا جائے۔ درج ذیل اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر
تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
تو اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مئے لا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ ادھر نہ ادھر
زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا

اکبر جدید افکار ونظریات کی صحت مند قدروں کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ حاکم کے علم وفن تہذیب وتمدن کو غور وفکر کے بعد قبول کرنے کے قائل تھے کیونکہ اکثر وبیشتر حاکم کے علم وفنون محکوم قوم کے لئے سم قاتل ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ محکوم قوم فکر وبصیرت سے بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی محرومی ومحکومی کے حقیقی اسباب کو سمجھنے سے قاصر ہو جاتی ہے اور فکری فقدان کے سبب محکوم قوم کے افراد سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اقبالؔ کا یہ شعر اسی ناکامی کی گہرائی وگیرائی کا احساس دلاتا ہے:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

جب معاشرہ کے دل سے احساس زیاں چلا جاتا ہے تو وہ حاکم قوم کی نقالی کو ترقی کا اعلیٰ محور تصور کرنے لگتا ہے۔ ان ہی سیاسی، سماجی اور ادبی بے اعتدالیوں کی طرف اکبؔر نے اپنی طنزیہ شاعری سے لوگوں کو متوجہ کیا۔ درج ذیل اشعار اس کی غمازی کرتے ہیں:

آگاہ ہوں سن خوش اقبالؔ سے
واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر
چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

....

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے، اس لئے بے تال وسم ہوں گے

اکبؔر نے جب ہندوستانی معاشرہ پر نگاہ ڈالی تو ان کو احساس ہوا کہ مسلمانوں کا اہل علم کا ایک طبقہ انگریزوں کے سیاسی وتہذیبی غلبہ کی وجہ سے انگریزی زبان وثقافت اور معاشرتی لوازمات کو سمجھ رہا ہے۔ اکبر نے ان نظریات کو رد کیا اور کہا کہ دراصل مغربی تہذیب وتمدن نہیں بلکہ وہ فکر بلند سربلندی کے لئے ذمہ دار ہے جس نے ان کے جوش وجذبہ کو مضطرب کر رکھا ہے۔ انہوں نے تاریخی حوالے سے یہ باور کرایا کہ جب مسلمانوں کے اندر جرأت وبے باکی اور حوصلہ تھا اس وقت وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب آنے کی قدرت رکھتے تھے تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ مسلمانوں کی اس بے حسی اور انفعالی کیفیت کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں:

مسلمانو! بتاؤ تو، تمہیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اس کا اثر کچھ ہے
حریفوں کی تعلّی باعث سوزِ جگر کچھ ہے
تمہیں معلوم ہے کچھ، رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو، راہ ترقی سے جدا ہو کر
تمہاری وضع دلکش تھی، تمہاری شان عالی تھی
خوش اخلاقی تمہاری مظہر شانِ جمالی تھی
نہیں ہے ہائے افسوس اب تمہارا وہ چلن باقی

نہ وہ ذوق ہنر مندی، نہ شوق علم و فن باقی
نہ دل میں ہے وہ جوش حب یاران وطن باقی
جو فکریں ہیں تو اپنے نفس کی راحت رسانی کی
توقع کیا اسی پر ہے خدا کی مہربانی کی

اکبر کے بارے میں یہ خیال عام ہے وہ مغربی تعلیم وترقی کے کورانہ مخالف تھے ان کی یہ مخالفت قدامت پرستی کا نتیجہ تھی حقیقت میں ایسا نہیں ہے اکبر نے خود انگریزی پڑھی اور اپنے صاحبزادے کو بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے برطانیہ بھیجا تھا۔ وہ اس بات کے دل سے متمنی تھے کہ مسلم نوجوان جدید علوم وفنون کے حصول اور اس میں دستگاہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں وہ نوجوانانِ قوم کو حصول علم وفن کی ترغیب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو، تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے، اطرافِ عالم میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو! ہوش میں آؤ!
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو، ہوش میں آؤ!

اکبر کی طنزیہ شاعری میں ایک بہت نمایاں پہلو نئے زمانے کے تقاضوں سے متاثر ہوکر آزادی نسواں کا مسئلہ تھا وہ تعلیم نسواں کو مغربی تہذیب کی تقلید کا ہی شاخسانہ سمجھتے تھے اس لئے سخت مخالف رہے اُن کا نظریہ کہیں نہ کہیں یہ ضرور تھا کہ ہندوستانی عورت کو اگر مغربی طرز پر تعلیم دی گئی تو وہ مشرقیت کی شناخت کھو بیٹھے گی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اندھی تقلید کے چلتے وہ عصمت وعفت کی بھی حفاظت بھول جائے انھیں خیالات کے پیش نظر وہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

....

ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ ابا اور بھی گھبرائیں اماں سے

....

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

اتنی مخالفت کے باوجود اکبر کو یہ احساس ڈرانے لگا کہ وہ رنگ جہاں کو بدل نہیں سکتے اور آہستہ آہستہ وہ اس سے متفق نظر آنے لگے۔ حالانکہ وہ تعلیم کے خلاف نہ تھے بس مشرقی تہذیب کے بالکل ختم ہوجانے سے پریشان تھے کہ کہیں عورتیں تعلیم یافتہ ہوکر اپنے حدود سے گریزاں نہ ہوجائیں گھرداری، بچوں کی تربیت اور خاندان کی روایت فراموش نہ کر بیٹھیں۔ تبھی تو انھوں نے یہ طرز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

تعلیم لڑکیوں کو ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

آگے چل کر اکبر نے ایک نظم ''مشرقی اور مغربی تہذیب'' بھی لکھی جس میں انھوں نے وضاحت کی کہ عورتوں کو کس قسم کی تعلیم ملنا چاہئے۔

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

یہ اشعار اکبر الہ آبادی کی شاعرانہ زبان میں تہذیبی تضادات کو نہایت چست اور طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

نیز یہ اشعار اکبر کے ان نظریات کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ اکبر انگریزی تعلیم کے قائل تھے وہ نوجوانان قوم سے انگریزی تعلیم کے ساتھ مشرقی اقدار ملی تشخص، مذہب اور تہذیبی اقدار سے بہرہ ور ہونے کے خواہش مند تھے:

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں کھیلو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کی معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

صدیق الرحمٰن قدوائی اپنی کتاب ''انتخاب اکبرالہ آبادی'' میں لکھتے ہیں:

''اکبر کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا.........سرسید تحریک کے علمبرداروں نے اور اکبر نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعہ قومی اصلاح کی کوشش کی۔سماجی اعتبار سے متضاد نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود سرسید حالؔی اور اکبر یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ اکبرالہ آبادی نے انگریزی زبان یا مغرب کی اچھی چیزوں کو اختیار کرنے سے منع نہیں کیا اور اپنی شاعری میں انگریزی کی تنقید کی بھی تو ان کا اشارہ انگریزی یا مغربی تہذیب کی طرف تھا۔انھوں نے خود جا بجا انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کیا جو ثابت کرتا ہے کہ وہ زبان کے مخالف نہیں تھے بلکہ اپنی تہذیب کی شناخت کی حفاظت کے آرزومند تھے۔

اس کے علاوہ انھوں نے عدم توازن، بے راہ روی، ریاکاری کی شکار ہر سماجی روش اور شخصی منہاج کو ہدف ملامت بتایا۔اکبر کے ہدف ملامت اکثر مغرب زدہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔مثلاً

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر کے یہ اشعار ان کے ان خدشات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم کے دوررس اثرات مرتب نہ ہوں نہیں تو ہندوستانی معاشرہ مادیت اور دہریت کا شکار ہو جائے گا۔

مجموعی اعتبار سے اگر اکبر کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اکبر ایسے شاعر تھے جو اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ مسلم قوم دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرے اسی ملی درد اور قومی فلاح کے جذبے کو انھوں نے اشعار کا جامہ پہنایا ہے ان کی طنزیہ شاعری میں ایک گہری فکر پائی جاتی ہے جس کے سبب قاری اپنے گرد و پیش پر نگاہ دوڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ان کے کلام میں اصلاحی رنگ غالب ہے ان کی شاعری اپنے دور کے تہذیبی تصادم اور سماجی تبدیلیوں کی بہترین ترجمان ہے۔انہوں نے مغربی تہذیب کے مضر اثرات کا جس باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور ان کو طنز و مزاح کے پیرائے میں جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ ندرت بیان اور قدرت کلام دونوں کا حسین نمونہ ہے۔اکبر نے زبان اور تکنیک دونوں لحاظ سے اردو شاعری کو وسعت دی۔اکبر نے مقصدی اور اصلاحی موضوعات کے لئے باقاعدہ طور پر طنزیہ شاعری کو زبان بخشی ان کی تقلید میں بعد کے شعراء اس فن میں اپنی شناخت قائم رکھنا قابل فخر سمجھنے لگے ان عوامل و محرکات کی بنیاد پر اکبر کو بجا طور پر اردو میں طنزیہ شاعری کا نقیب قرار دیا جا سکتا ہے۔

مراجع:

۱۔ وزیر آغا، اردو میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
۲۔ پروفیسر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء
۳۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی، اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر ایک نظر، ایوان اردو، مارچ ۲۰۰۳ء
۴۔ اکبرالہ آبادی، کلیات اکبرالہ آبادی، سنٹرل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۱۹۵۹ء
۵۔ صدیق الرحمٰن قدوائی، انتخاب اکبرالہ آبادی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

اکبرالہٰ آبادی کی فارسی شاعری

اکبرالہ آبادی اردو زبان وادب کے ایک مشہور ومقبول ،سنجیدہ طنزنویس اور ذمہ دار مزاح گو شاعر شمار کیے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے متین، مناسب اور متوازن وطنز مزاح کے ذریعے بہت سے حساس سیاسی ،سماجی اور مذہبی موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ان کے انفرادی انداز بیان، ندرت فکر اور زبان کی چاشنی نے اردو شاعری کی روایت میں ایک ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے،اس شاعر بزرگ کے کلام میں ہمیں معاشرتی ،سیاسی اور سماجی شعور کے بڑی شاندار اور جاندار نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں ان کی شاعری ان کے زمانے اور زندگی کی بڑی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتی ہے۔اکبر کا انداز بیان کہیں کہیں قلندرانہ، کہیں شاعرانہ، کہیں تراش خراش کے ساتھ، کہیں سادہ، کہیں روایتی اور کہیں جدت پسندانہ اور انقلابی نظر آتا ہے۔ان کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ روایتی شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک باغی شاعر نظر آتے ہیں اور ان کے مزاج میں بغاوت کا مادہ اپنے پورے عروج پر ہونے کے باوجود بھی وہ فرد و معاشرے کی اصلاح پر بھر پور توجہ صرف کرتے تھے۔ان کا کلام خواہ وہ اردو میں ہو یا پھر فارسی میں خواص اور عوام دونوں کو متاثر کرتا ہے ان۔غالبًا اکبر اپنے دور کے پہلے ایسے شاعر کہے جاسکتے ہیں جنھوں نے بغیر کسی کی بارسوخ شخصیت اور اعلیٰ مناصب کو خاطر میں لائے اپنے دل کی سچی اور حقیقی آواز کو لوگوں تک پہنچایا اور ان میں درست طریقے سے غور وفکر کرنے کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا، آج ہمارے سامنے مختلف شواہد موجود ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ اس شاعر بے باک نے نہ تو مولویوں اور مذہبی ٹھیکیداروں سے اثرات قبول کیئے، نہ برطانوی فرمان رواؤں کی قوت کے سامنے سر تسلیم خم کیا، نہ کبھی سیاسی رہنماؤں کے جھوٹے وعدوں کا یقین کیا اور نہ ہی مغربی چمک دمک سے مرعوب ہوئے۔اکبر اپنے عہد کے اکیلے ایسے بے خوف وبے باک شاعر ہیں جس نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ

حکمرانوں کے ظلم وستم کا پردہ فاش کرنے میں کسی قسم کی مصلحت اختیار نہیں کی اور حاکمین وقت کی ایسی خبر لی کہ لوگ ان کی اس بے پناہ جرات وبے باقی پر انگشت بدندان رہ گئے۔اکبر نے فرد اور سماج کی اصلاح کے لیے جو منفرد اور انوکھا انداز بیان اختیار کیا ہے اس کی مثال ان کے معاصرین شاعروں میں کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتی ہے اکبرالہٰ آبادی کی انھیں خصوصیات کے سبب انھیں اپنے زمانے سے لے کر آج تک خاصی مقبولیت واہمیت حاصل رہی ہے ان کی قومی، سیاسی اور ملی شاعری کی خصوصیات کا محاسبہ کرتے ہوئے جناب نورالرحمٰن نے بالکل درست کہا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اکبر کا موضوع سخن انسان اور سماج ہے اور اُس کی شاعری اس معنی میں قومی شاعری ہے لیکن وہ جن مسائل سے بحث کرتا ہے وہ دوسرے قومی شاعروں سے مختلف ہیں۔اسی لئے اکبر قومی شاعری کے میدان میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز و بلند نظر آتے ہیں۔اکبر کی فکر کسی جماعت یا طبقہ میں محدود نہ تھی، وہ انسانیت اور کائنات کی وسیع فضا میں سانس لیتا تھا وہ زندگی کے ہر پہلو اور انسانی تگ ودو کے ہر میدان تک رسائی رکھتا تھا، وہ انسان کے ضمیر اور اس کے مقاصد کی بلندیوں تک پہنچتا تھا''[1]

اکبر کا نام سید اکبر حسین اور تخلص اکبر تھا اور ان کا تعلق یوپی کے ایک معزز، معتبر اور خوشحال خانوادے سے تھا۔ان کے والد محترم کا نام سید تفضیل حسین تھا، اکبرالہ آبادی ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء بہ مقام موضع بارہ جو الہ آباد سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے، پیدا ہوئے۔ان کے گھر کا ماحول بہت مذہبی اور ادبی تھا اپنے زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے ہی حاصل کی، ان کی ابتدائی تعلیم کے متعلق بہت زیادہ معتبر اور مستند شواہد تو نہیں ملتے ہیں البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اکبر نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور علم ریاضی وغیرہ کی ابتدائی کتابیں اپنے والد یا اپنے گھر ہی میں اپنے بزرگوں سے پڑھی تھیں، اور اس کے بعد سرکاری مدارس میں ان کی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔چونکہ کاتب ازل کی طرف سے ذہن رسا لے کر آئے تھے، لہٰذا بہت کم وقت میں ہی مختلف علوم وفنون میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔اکبرالہ آبادی نے اپنی عملی زندگی کی باقاعدہ اور باضابطہ شروعات عرض نویسی سے کی تھی۔انھوں نے ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔اور سرکاری ملازمت میں نائب تحصیل دار ہو گئے تھے ۱۸۷۲ء میں

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ، اسسٹنٹ پروفیسر فارسی، شعبۂ عربی وفارسی اکبرالہٰ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

ہائی کورٹ کی مسل خوانی کی جگہ ملی، اوراس کے بعد ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۸۰ء تک وکالت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے اوراس کے بعد ترقی کرتے کرتے ۱۸۸۱ء میں منصف کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۸۹۴ء میں ان کو سیشن جج کا عہدہ بھی تفویض کیا گیا، ان کی خدمات کے عوض انھیں ۱۸۹۸ء میں ان کو بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اوراس کے بعد ''لسان العرب'' کا خطاب دیا گیا لیکن افسوس کہ ۱۹۰۳ء میں وہ ضعف بینائی اور خرابی صحت کی بنا پر قبل از وقت اپنی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے تھے، ملازمت سے فراغت حاصل کر لینےکے بعد پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ شعری ادب کی آبیاری اور نگہداشت کرتے ہوئے اپنی بقیہ عمر گزاری۔ اس دانشور بزرگ نے ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء میں شہرالہ آباد ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں مدفون ہوئے۔

جیسا کہ ہم سب واقف ہیں کہ اکبرالہ آبادی کی شہرت ومقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ان کی اردوشاعری ہے لیکن بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے، ان کی فارسی شاعری میں بھی سنجیدہ مضامین کے علاوہ، طنز ومزاح کے وہی عناصر موجود ہیں جوان کی اردوشاعری میں نظم کئے جاتے رہے ہیں۔ اکبر نے فارسی شاعری میں اپنا کوئی دیوان یادگار تو نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کے اردو دیوان میں ہی ان کی فارسی شاعری کے جستہ جستہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ یہ فارسی کلام اتنی مقدار میں نہیں تھا کہ اس کو ایک الگ سے دیوان کی شکل میں ترتیب دیا جا سکے اس لیے انھوں نے بھی اس کی جمع آوری پر کوئی خاص دھیان انہیں دیا، لبتہ ان کے فارسی کلام کے متعلق بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' یعنی بھلے ہی ان کا کلام کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ نہ ہوالبتہ کیفیت کے اعتبار سے خاصا دلچسپ، دلکش اور توجہ طلب ہے، اکبر کی فارسی شاعری بھلے ہی ان کی اردوشاعری کے مقابلے میں بہت کم بلکہ نہ کے برابر ہے، لیکن اس نہ کے برابر فارسی شاعری میں بھی ان کی انفرادی شناخت اور شخصی آن بان اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ انہوں نے فارسی زبان میں بھی کم وبیش انھیں موضوعات کو نظم کیا ہے جوان کی اردوشاعری کا طرہ امتیاز سمجھے جاتے ہیں یعنی ان کے اردوکلام کی طرح ان کے فارسی کلام میں بھی معاشرتی اور سیاسی مسائل پر اپنے خیالات واحساسات کو بڑے ظریفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کی فارسی شاعری میں بھی طنز ومزاح کا وہی عنصر غالب ہے جو اردو میں انہوں نے پیش کیا ہے، اکبر نے فارسی زبان میں بھی معاشرتی برائیوں اور سماجی مسائل پر کھل کر تنقید بلکہ تعریض کی ہے۔ اس شاعر بزرگ نے فارسی زبان میں بھی اردو ہی کی طرح سیاسی موضوعات پر بھی اپنے سچے اور حقیقی جذبات ومشاہدات کو نظم کیا ہے، اور انگریزی حکومت کے ظلم وستم اور مغربی تہذیب وتمدن کے سبب معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی برائیوں کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے انھوں نے عوام وخواص کو حالات سے نبرد آزما ہونے کا جو پر جوش اور پر ہوش پیغام بھی دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں وہ اپنے وقت کے حالات پر زبردست چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کس نماند کہ در بیشہ شکاری بکند
تیغ گیرد بہ کف وفتح ویاری بکند
این زمان ہمت مردان بہ ہمین محدود است
زنی از پردہ برون آید وکاری بکند''۲

اکبرالہٰ آبادی نے فارسی زبان کس سے اور کب سیکھی تھی اس کا حتمی جواب دے پانا تو قدرے مشکل ہے، کیونکہ انھوں نے یا ان کے معاصرین محققین نے ان کی فارسی تعلیمات کے سلسلے میں کوئی حتمی اور واقعی اطلاعات فراہم نہیں کی ہیں اس لیے وثوق کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے البتہ گمان اغلب یہ ہی ہے کہ انھوں نے ابتدائی دور میں اپنے والد محترم سے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی باقاعدہ طور پر درس حاصل کیا ہوگا، کیونکہ ان کی فارسی زبان میں شعر گوئی کی استادانہ مہارت بتاتی ہے کہ انھوں نے رسمی تعلیم کے ابتدائی مراحل میں بھی فارسی کی ابتدائی کتابیں ضرور پڑھی ہوں گی اوراس کے بعد اپنے زمانے کے فارسی شعرا اور اساتید کی صحبت ضرور اختیار کی ہوگی البتہ یہ بات تو پورے یقین وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اکبر نے اپنے دور کے عربی وفارسی کے مشہور دانشور ''سخنان الہند'' جناب کیفی چریا کوٹی کے والد محترم مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی سے درس کی سعادت حاصل کی تھی اور عمر کے آخری منزل تک بھی ان کو اپنا کلام دکھاتے رہے تھے، بہت ممکن ہے کہ فارسی کی تعلیم کے لیے انھوں نے اور لوگوں کے حلقہ درس میں شامل ہو کر بھی اپنی فارسی استعداد بڑھائی

ہوالبتہ حتمی طور پر کچھ کہہ پانا مشکل ہے، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب نے آقائے سید عشرت حسین کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی فارسی دانی کے متعلق صرف اسی قدر اطلاعات فراہم کی ہیں:

''گھر پر کچھ فارسی عربی اور ریاضی میں بھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔۔۔۔اکبر کے حصول تعلیم کا یہ تمام زمانہ محض چار پانچ برسوں تک محیط ہے، انہوں نے اس کے بعد بھی ذاتی مطالعہ ہمیشہ جاری رکھا اور وفات تک مختلف علوم کی کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہے، سید عشرت حسین لکھتے ہیں 'حضرت قبلہ نے مسلسل مطالعے سے کتنی قابلیت بڑھائی، اس کا اندازہ عربی، فارسی اور انگریزی کی ان کتابوں سے ہوسکتا ہے جو حضرت قبلہ کے کتب خانے میں موجود ہیں''[۳]

الہٰ آباد کے مشہور و معروف محقق اور اکبر شناس جناب طالب الہٰ آبادی نے بھی ان کی تعلیم کا ذکر بہت ہی سرسری انداز میں کیا ہے وہ ان کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے محض دس سال کی عمر میں اردو و فارسی زبانوں پر دستگاہ حاصل کر لی تھی وہ مختلف محققین کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معلوم نہیں اکبر مرحوم کے حالات زندگی لکھنے والے خواہ سر عبدالقادر ہوں یا محمد نصیر ہمایوں لکھتے ہیں، تعلیم بہت معمولی ہوئی" اسی سانس میں میں کہتے ہیں۔ابھی دس سال عمر نہ ہوئی تھی کہ اکبر اُردو میں بے تکلف خطوط لکھنے لگے اور فارسی میں اپنے ہم عمروں سے بہت بڑھ گئے تھے۔۔۔۔۔مجلس شعرا میں جب کبھی حاجت ہوتی، اساتذہ فن کے فارسی اور اردو کلام سے بہت سی سندیں پیش کر دیا کرتے تھے''[۴]

جیسا کہ قبلاً بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ اکبر الہٰ آبادی نے فارسی شاعری میں اپنا کوئی دیوان یادگار نہیں چھوڑا ہے لیکن ان کے اردو کلیات میں ان کا فارسی کلام، مختلف صورتوں میں پھیلا ہوا ہے مثلاً ان کی فارسی غزلیات اور قطعات جو خالص فارسی زبان میں نظم کیے گئے ہیں، ان کی تعداد قدرے کم ہے اس کے علاوہ ان کی اردو غزلیات اور قطعات وغیرہ جن کے کچھ شعر یا مصرعے تو اردو زبان میں کہے گئے اور کچھ فارسی زبان میں پیش کیے گئے ہیں ان کی تعداد قدرے زیادہ ہے۔

اکبر الہٰ آبادی کے فارسی کلام کے موضوعات کی بات کی جائے تو ان میں تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے یعنی ان کے فارسی کلام ایک طرف متوازن، سنجیدہ اور پروقار مضامین پر مشتمل ہے تو وہیں دوسری طرف طنز و ظرافت اور طعن و تشنیع اور عشق و عاشقی وغیرہ جیسے موضوعات کو بھی انھوں نے اپنی فارسی شاعری میں بڑی ہنرمندی، سلیقے اور نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ وہ ہی موضوعات ہیں جو ان کی اردو شاعری کا طرہ امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔اکبر کے فارسی کلام کے مطالعے سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دانشور بزرگ کو اردو کی طرح فارسی زبان پر بھی خاصی مہارت حاصل تھی، انھوں نے اپنے کلام میں فارسی الفاظ، تراکیب اور عبارات کو جس چابک دستی اور ماہرانہ انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی وہ اس دانشور بزرگ کا ایک عظیم اور بہترین ادبی کارنامہ کہا جا سکتا ہے، ان کی زبان و بیان میں بڑی سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے جو پڑھنے والوں کو بیساختہ اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اور وہ چاہ کر بھی وہ ان کی سحر بیانی کے اثر سے خود کو محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے سے پہلے فارسی زبان رائج رہی تھی اور زیادہ تر شعراء و نویسندگان اپنے علمی شہہ پاروں کو منظر عام پر لانے کے لیے اسی زبان کو زیادہ معتبر، مستند اور درخور اعتنا تصور کرتے تھے لیکن جب ملک بھر میں انگریزوں نے اپنے مکر و فریب کا جال پھیلا کر وطن عزیز کی ہر چیز کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تو ظاہر ہے کہ زبان و ادب اس سے مستثنیٰ کیونکر رہ سکتا تھا، لہٰذا مغل حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہ فارسی زبان پر بھی زوال و انحطاط کے سیاہ بادل مسلط ہو گئے انگریزوں نے سوچی سمجھی سازشوں اور مختلف حیلوں و بہانوں کے ذریعے یہاں کے لوگوں کے اذہان وقلوب سے اس زبان کی شیرینی، عذوبت اور لطافت کو محو کرنا شروع کر دیا اور دانستہ طور پر اس کی جگہ ایک نوخیز زبان یعنی اردو کو اس کے بالمقابل لا کر کھڑا کر دیا تا کہ ہندوستانی دانشوروں کے اذہان کو زنگ آلودہ کیا جا سکے، اور حیلہ پرور انگریز اپنی شاطرانہ چالوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے لیکن انھیں صد فی صد کامیابی حاصل نہیں ہوسکی یعنی وہ اس دلکش اور لطیف زبان کے اثرات کو ان کے قلوب سے پوری طرح ختم کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے اور اہل ہند کے

یہاں اس زبان کو اعتماد و وقار اسی طرح باقی رہا، چونکہ فارسی زبان وادب کی جڑیں ہندوستانی معاشرے میں بہت گہری اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں جن کو یک لخت اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں تھا یہ ہی سبب ہے کہ فارسی زبان وادب کی تمام تر زوال پذیری کے باوجود بھی فارسی زبان، عوام وخواص میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اپنوں و بیگانوں کی ستم ظریفی کے سبب اب اس زبان ادب میں وہ توانائی و برنائی باقی نہیں رہ گئی تھی جو عہد گذشتہ میں اس کو حاصل رہی تھی۔ با این ہمہ شعرا اس زبان میں شعر کہنا باعث افتخار تصور کرتے تھے، اکبرالہ آبادی نے جس دور میں اپنی شاعری کے اعلیٰ نمونے دنیا کے سامنے پیش کئیا س وقت تک فارسی کا چلن نہ کے برابر رہ گیا تھا اور ریختہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس کے علاوہ فرمان رواؤں کی ریختہ گوئی سے حمائت وتشویق کے سبب بھی شعرا اور ادبا فارسی زبان میں طبع آزمائی کرنے کے بجائے ریختہ گوئی کی طرف زیادہ راغب ومائل ہور ہے تھے ،اکبر نے بھی رنگ زمانہ اختیار کرتے ہوئے ریختہ گوئی کی طرف ہی زیادہ توجہ مبذول رکھی تھی البتہ گاہے بگاہے فارسی میں بھی شعر کہتے رہتے تھےلیکن وہ پوری سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کر سکے، اور یہ ہی سبب ہے کہ ان کے فارسی کلام میں اس قدر تنوع و درخشندگی نہیں ہے جو ان کے اردو کلام کا خاصہ رہی ہے۔ اکبرالہ آبادی بھلے ہی فارسی زبان پر خاصی قدرت رکھتے تھے با این ہمہ انھوں نے اپنا بیشتر فارسی کلام ایرانی شاعروں کی تقلید وتتبع میں ہی پیش کیا ہے، اسی لیےان کے فارسی کلام کا ایک بڑا حصہ ایران کے مشہور ومعروف شعرا کے کلام کے اوزان وبحور یا انھیں کے رنگ میں ڈوب کر کہا گیا ہے حالانکہ ان کی زبان وبیان کی روشنی میں بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ایرانی شاعروں کی تقلید وپیروی نہ بھی اختیار کرتے تو بھی اردو شاعری ہی کی طرح فارسی میں بھی اپنی ایک انفرادی شناخت اور پہچان قائم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ،لیکن انھوں نے ایسا کرنے کے بجائے ایران کے اساتذہ شعرا کی تقلید وپیروی پر ہی اکتفا کیا ہے خصوصاً حافظ شیرازی کے کلام کی تقلید وپیروی میں تو خصوصی اہتمام کیا ہے۔اب ذیل میں ان کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جو انھوں نیا پنے مزاج کے خلاف نہائت سنجیدہ اور متین فارسی میں کہے ہیں یہ اشعار فارسی ادب کے سب سے بڑے غزل گو شاعر حافظ شیرازی کی تقلید وپیروی کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں:

محمد آن را ہمہ اوصاف و ثناہا خوانند　　مومن را بجز اشند بہ دشنامی چند
غیرت دین بفروشند بہ یک غمزہ کفر　　چشم پوشند ز ملت پی خود کامی چند
روح خود را چو سپردی بہ غلامی حریف　　چہ کنی ناز بہ نامی و بہ خدامی چند
پختہ وضعی کہ خدا عقل وتمیز ش داوست　　قدمی ھمن نہد در رہ این خامی چند
ورد این نغمہ حافظ کن وخوش باش اکبر　　ہان تو از بادہ شیراز بزن جامی چند
ای گدایان خرابات خدا یار شماست　　چشم انعام مدارید ز انعامی چند'' ؎۵

مندرجہ بالا اشعار حافظ شیرازی کی ایک بہت ہی مشہور ومعروف غزل کے تتبع وتقلید میں کہے گئے ہیں اور وزن وبحر اور ردیف وقافیہ میں اس شاعر عالی نے پوری طرح حافظ کی تقلید کرنے کی بڑی ہی کامیاب کوشش کی ہے حالانکہ ان کےان کے یہاں حافظ کی طرح بلند خیالی اور زور بیانی تو موجود نہیں ہے لیکن ان کے دلکش انداز بیان کے سبب اس میں بڑی زیبائی اور رعنائی پائی جاتی ہے، حافظ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

''حسب حالی نہ نوشتی و شد ایامی چند　　محرمی کو کہ فرستم بہ تو پیغامی چند؟
ما بدان مقصدعالی نتوانیم رسید　　ہم مگر پیش نہدلطف شما گامی چند
چون می از خُم بہ سبو رفت وگُل افکند نقاب　　فرصتِ عیش نگہ دار و بزن جامی چند'' ؎۶

اکبرالہ آبادی کی ایک اور غزل دیکھئے جو انھوں نے حافظ شیرازی کی تقلید وپیروی میں کہی ہے حافظ شیرازی کے دیوان میں، میرس کی ردیف میں کئی غزلیں ملتی ہیں جو اپنے تنوع اور رنگا رنگی کے سبب خاصی مشہور بھی ہیں اکبر نے حافظ کا رنگ وآہنگ اختیار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل غزل پیش کی ہے جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کی غزل میں عشقیہ اشعار بڑے ہی موثر اور دل کش انداز میں نظم کیے گئے ہیں، ان کی زبان اور بیان اس قدر اعلیٰ اور دل نشین ہے کہ

بعض اوقات تو ان پر اہل زبان ہونے کا گمان گزرتا ہے ان کی خود اعتمادی اور جذبات کی شدت معموران کی غزل کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے اپنے دل میں موجود بے شمار تمناؤں، آرزؤں حسرتوں اور خواہشوں کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرے دل کی محرومیوں اور ناکامیوں نے ہی مجھ کو یہ طرز سخن عطا کیا ہے، میں نے کسی استاد سے سخنوری کی تعلیم حاصل نہیں کی ہے بلکہ غم ہجر اور شدت غم نے مجھ کو یہ انداز بیان بخشا ہے:

''غم ہجر تو چہ کردہ است، بہ من ہیچ مپرس — گریہ می آیدم از رنج ومحن، ہیچ مپرس
نالہ من چو توانی بر یاران برسان — ای صبا قصہ دوری وطن ہیچ مپرس
بشنو از مرگ من وفارغ وخورم بہ نشین — باش مستغی واز گور وکفن ہیچ مپرس
وقتی ہست بہ تشریح کمر ہیچ مگو — مشکلی ہست ز اسرار دہن ہیچ مپرس
آخر فصل بہار است دوم رخصت گل — دیگر از حسرت مرغان چمن ہیچ مپرس
شوقم آمادہ و دل مایل وقاتل بہ کمین — اندرین وقت ز بی صبری من ہیچ مپرس
حسرتی چندان بہ دل دارم واین نکتہ بس است — وزکہ آموختہ طرز سخن ہیچ مپرس
مگو از لعل سیمانی وبہ بین لخت دلم — اشک من بنگرد و از در عدن ہیچ مپرس'' ۷

اکبر کی فارسی شاعری میں ہمیں عشقیہ اشعار بھی بڑی فراوانی کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں ان کا دل کش اور شیریں عاشقانہ انداز بیان روائتی شاعروں سے مختلف اور جداگانہ ہے عشق کا جو رنگ ہمیں اکبر کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اس کی مثالیں ان کے معاصرین شاعروں کے یہاں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہیں، ان کی عشقیہ شاعری میں نہ تو دیگر شاعروں کی طرح مایوسی ونامرادی، دل گرفتگی وخستگی اور یاس ونامیدی کی داستان غم انگیز ہے اور نہ ہی عام عشقیہ شاعری کرنے والے شعرا کی طرح سطح وبے صبری اور چھچھوراپن وبازاری جملے بازی کی نمائندگی کرتی ہے، اکبر معشوق کی شوخیوں، بے وفائیوں اور بے نیازیوں سے تنگ آ کر مایوس نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی اس بت طناز کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے وہ عشق کی تمام تر شدت کے باوجود بھی اپنی آن بان، وقار وشان اور انا وخودداری کو پوری طرح قائم رکھتا ہے اور کسی بھی حال میں اپنی خودداری اور انا کو محبوب کے پیروں تلے پایمال نہیں کرنے کا قائل نہیں ہیں۔ اب ذیل میں ان کی ایک فارسی غزل کے ملاحظہ کیجئے عاشقانہ رنگ لیے ہوئے ہے اس میں انھوں نے ایک عاشق دنیادار کے دل پر گزرنے والی ہمہ کیفیات اور اس کے احساسات کو بڑی ہنرمندی، خوش سلیقگی، اثر آفرینی اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

''وقت بہار گل دلم از ہوش دور بود — موج نسیم دشمن شمع شعور بود
می گفت دوش قصہ شوکت زبان دل — ہر حرف او حکایت موسیٰ وطور بود
یک جلوہ کرد وصورت پروانہ سوختم — آری ہمین علاج دل تا صبور بود
کوش بود آن زمان خودی از خود خبر نداشت — ہوشم بخواب بود ودلم در حضور بود
یک ساعت حضوری او این چنین گذشت — من عجز بودم او ہمہ ناز وغرور بود
بیدل مشو بہ گفتہ منکر کہ او ز جہل — وہمش بہ گفت آنچہ بچشم تو نور بود
اکبر بہ پیش پیر مغان کرد اعتراف — غوغای من بہ خلق ہمہ مکرو وزور بود'' ۸

اکبرالہٰ آبادی کی ایک اور عشقیہ غزل ملاحظہ فرمائیے جس میں ایک عاشق نامراد کی ناکامی اور حرماں نصیبی کی داستان کو بڑے موثر اور دلکش پیرایہ میں نظم کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے، شاعر کی عشق میں تمام تر مایوسی اور نامرادی کے باوجود بھی آرزو اور امید کا ایک بحر بیکراں موجود ہے جو اس کو کسی بھی حال میں اس کی محبت سے دستبردار نہیں ہونے دیتا گو کہ عمر گذر گئی ہے لیکن جس طرح پھول کے مرجھانے کے باوجود اس میں مہک باقی رہ ہی جاتی ہے ٹھیک اسی طرح شاعر کا دل بھلے ہی عشق میں ناکامی کے سبب افسردہ ونامراد ہو چکا ہے لیکن اس میں آرزوئیں اور تمنائیں اسی طرح باقی ہیں جس طرح اس کی عمر کے ابتدائی دور

میں موجود تھیں اور ہمیشہ اس کو پرامید رکھتی تھیں، لہٰذا کہتا ہے:

''دلم فسردہ شد و عشق و آرزو باقی است　　نماند درگل پژمردہ رنگ و بو باقی است
گمان مبر کہ ستم کردی و وفا کنم　　بیا بیا کہ ہمان شوق و آرزو باقی است
فغان کہ آتش غم زیر خاک ہم نگذاشت　　ہنوز سوز دل و آہ شعلہ خو باقی است
بہ بحر عشق فتادیم دوست وپا نہ زدیم　　ہزار منت ہمت کہ آبرو باقی است
اجل بیامد وجانم ببرد رول بگذاشت　　فغان کہ جان عزیزم شد وعدد باقی است
فدای بصورت زیبا رخی کہ فانی نیست　　نثار حسن حسینی کہ حسن او باقی است
پس فنا بہ لحد ہم قرار نیست مرا　　مگر بہ دل خلش خار آرزو باقی است
حسن فانی دنیا مبند دل اکبر　　فنا شود رہ آن کس کہ نام او بقی است'' ۹

اکبرالہ آبادی کے فارسی کلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بعض فارسی اشعار کی پیروڈی بھی لکھی ہے، پیروڈی اس منظوم یا منثور صنف کو کہتے ہیں جو کسی کے طرز تحریر کی نقل میں لکھی گئی ہو اور کسی شاعر یا مصنف کی اصل تحریر کے بعض الفاظ یا جملوں یا پھر خیالات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ اس میں طنز ومزاح رنگ پیدا ہو جائے۔ اردو زبان میں پیروڈی کے لیے ''تحریف'' کا لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے مختلف لغات میں تحریف کے معنی تحریر میں اصل الفاظ بدل کر کچھ اور لکھ دینا مراد لیا جاتا ہے۔ یعنی اس میں اصل لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ فٹ کر کے صورتحال کو بڑی خوبصورتی سے الٹ دیا جاتا ہے۔ ہمیں اکبر الہٰ آبادی کے فارسی کلام میں پیروڈی کی یہ صنف اپنے پورے طمطراق اور کامیابی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے، اس شاعر عالی نے پیروڈی کے ذریعے نہ صرف طنز ومزاح کے عنصر کو پیدا کیا ہے بلکہ پیروڈی کی صنف پر طبع آزمائی کرتے وقت انھوں نے اصلاح معاشرہ پر بھی خصوصی توجہ صرف کی ہے، ان کی پیروڈی میں طنز ومزاح میں خوش دلی، شادمانی اور محبت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے جس کا مقصد صرف پڑھنے والوں کو ہنسانا اور ان کی زندگی میں خوشی لانا ہی نہیں ہے، بلکہ ناپسندیدہ رویوں اور سماجی خرابیوں پر تعریض وتنقید کرنا بھی ہوتا ہے تاکہ معاشرے کو بہتری کے راستے پر گامزن کیا جا سکے، ان کے طنز ومزاح کا دلکش اور متوازن امتزاج معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور خامیوں کو کبھی نرمی تو کبھی تلخی سے بیان کرتا ہے، جس سے قاری نہ صرف مسکرانے بلکہ غور وفکر کرنے پر بھی پر مجبور ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کی پیروڈی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں حافظ شیرازی کی ایک مشہور ومعروف غزل کے چند اشعار دیکھئے:

''سحر بلبل حکایت با صبا کرد　　کہ عشق گل بہ ما دیدی چہا کرد
خوش بادا نسیم صبح گاہی　　کہ درد شب نشینان را دوا کرد
من از بیگانگان ہرگز نہ نالم　　کہ با من ہر چہ کرد آن آشنا کرد
بشارت بر بکوی م‍ء فروشان　　کہ حافظ توبہ از زہد وریا کرد'' ۱۰

اکبرالہٰ آبادی نے حافظ شیرازی کی مندرجہ بالا غزل کے وزن وبحر میں ایک رباعی کہی ہے اور حافظ کے اشعار کے چند الفاظ میں معمولی تغیر وتبدیلی کی مدد سے انھوں نے قاری کو فکر وتامل کرنے کا جو سامان فراہم کیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور سزاوار تفکر ہے:

''سحر مسلم شکایت با صباخدا کرد　　کہ تفیرش بہ ما دیدی چہا کرد
من از بیگانگان ہرگز نہ نالم　　کہ بامن ہر چہ کرد آن آشنا کرد'' ۱۱

اہل نظر بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اکبر نے اپنے انوکھے انداز اور خوبصورت الفاظ کی مدد سے حقیقت کو بڑے ہی لطیف اور متین پیرایہ میں بیان کیا ہے گویا معانی کا ایک جہاں ہے جس کو انھوں نے ایک کوزے میں سمو دیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کا طنز بھی لوگوں کو کچھ دیر کے لیے ہی صحیح، یہ سوچنے پر مجبور ضرور کر دیتا ہے اسی طرح حافظ کی غزل کا ایک اور بہت ہی شعر ملاحظہ کیجئے جس کا ایک مصرعہ عربی ہے تو دوسرا فارسی اور مطبوعہ دیوان میں یہ ان کی پہلی غزل کا اولین شعر ہے، وہ

کہتے ہیں:

الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا	کہ عشق آسان نمود اول، ولی افتاد مشکلہا

اکبرالہ آبادی نے اس کی پیروڈی لکھی ہے اوراپنے مخصوص رنگ یعنی طنزومزاح کے ذریعے کاحسن پیدا کردیا ہے وہ کہتے ہیں:

''الایا ایہا الطفلک بجور احت بہ ناولہا	کہ قران سہل بود اول ولی افتاد مشکلہا

بکن تزئین پای خود بہ بوٹ ڈاسن وپتلون	کہ سر سید خبر دارد ز راہ ورسم منزلہا''۱۲

اکبرالہٰ آبادی کے کلام کی ایک نمایاں اور خاص خوبی جوان کو معاصرین ذولسانین شعرا کے جم غفیر میں ایک انفرادی حیثیت اور بلند مقام عطا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنے اردو کلام، بلکہ فارسی اشعار میں انگریزی وہندی الفاظ کی آمیزش اس قدر ہنرمندی اور چابک دستی کے ساتھ کی ہے کہ قارئین دادوتحسین دیئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی ہیں، اب ذیل میں ان کے بعض متفرق اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں ان کے اس سلیقے اور قرینے کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے اور فارسی کے ساتھ ہندی وانگریزی الفاظ کی پیوندکاری کی نفاست اور انفرادیت کو دیکھا جاسکتا ہے:

''در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست	بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

یاد دار این قول مولانای روم	مرد آخر بین مبارک بندہ ایست''۱۳

'سک زر با بوء ور دھوتی زرتار داشت	با وجودش نالہ ہاء زار در اخبار داشت

گفت مش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟	گفت مارا خوف فیس وٹکس دراین کار داشت''۱۴

''ہیت رانہ بر سر من جائے دستار اے عزیز	مرد تا مستر تواند شد چرا قبلہ شود؟'' ۱۵

''بگو بہ سیٹھ کہ او را بھرم نخواھد ماند	بگو بہ برہمن کہ اورادھرم نخواھد ماند

من ار چہ درنظر یار شرمسار شدم	رقیب نیز چنین محترم نخواھد ماند''۱۶

مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاعر نے فارسی میں انگلش اور ہندی کی آمیزش سے نہ صرف ان کے ظاہری شکل وصورت کو دلچسپ بنادیا ہے بلکہ ان کی معنویت اوراہمیت میں بھی چار چاند لگا دیئے ہیں اکبراس انداز بیان کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم بھی ہیں، فارسی شاعری میں انگریزی وہندی کی اس جالب وجاذب آمیزش کی عمدہ مثالیں ان کے عہد کے دوسرے شاعروں کے یہاں شاذونادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں یہ درست ہے کہ فارسی کے اہل زبان کے لیے اس قسم کے اشعار کو سمجھنا قدرے مشکل ہے لیکن اس سے ان کی شاعری کی ارزش وعظمت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

اکبرالہٰ آبادی کے فارسی کلام میں بہت سے تاریخی قطعات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو مختلف مواقع پر نظم کیے گئے ہیں، اکبر کے یہ قطعات تاریخی اور ادبی دونوں ہی اعتبار سے خاصے توجہ طلب اور سزاوار تامل ہیں، ذیل میں فقط ایک تاریخی قطعہ نقل کی جارہا ہے جو انھوں نے حبل المتین کے ایڈیٹر جناب سید جلال الدین طہرانی کی وفات کے موقع پر کہا تھا ان کا یہ قطعہ زبان وبیان کی دل کشی کے سبب بھی خاصا اہم اور قابل تفکر قرار دیا جاتا رہا ہے:

''طلغرافی چون فرستادی ز راہ لطف ومہر	جوش زد از دل سرور ولطفہا اندوختم

بسکہ شوق دعوت واسپیچ در دل داشتم	محفلی ترتیب دادم شمعہا افروختم

خادم خاص از پی آورد نت رفتہ بریل	نصف شب در انتظارات دیدہ برد رد وختم

چون شنیدم فسخ کردی عزم ورفتی بیدریغ	شمع را خاموش کردم خود سراپا سوختم''۱۷

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے فارسی شعروشاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ مثلاً غزلیات، قطعات، رباعیات اور نظمیں وغیرہ اور اپنے منفرد لب ولہجے کے سبب ان تمام اصناف میں نمایاں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ انھوں نے فارسی زبان کے روایتی شاعروں کی طرح متقدمین کی تقلید وپیروی پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اطباع وتقلید کے باوجود بھی انھوں نے اپنا ایک الگ رنگ اور انفرادی شناخت کو قائم کیا ہے ان کے فارسی کلام میں اعلیٰ مضامین کو بڑے

جالب اور جاذب انداز میں پیش کیا گیا ہے ان کا بیشتر فارسی کلام ان کی فکر کی گہرائی اور تہ داری کا آئینہ دار ہے جس کا مطالعہ قاری کے ذہن کے مختلف دریچوں کو وا کرتا ہے اور اس کو غور وفکر کے لیے نئی جہات عطا کرتا ہے۔

ماخذ

۱۔ اکبرالہ آبادی اور ان کا کلام، نورالرحمٰن ، یونین پریس دہلی ،۱۹۶۴،ص۱۱۔
۲۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۱۷۔
۳۔ اکبرالہ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور،۲۰۰۳،ص۱۷۔
۴۔ اکبرالہ آبادی، طالب الہ آبادی، مطبوعہ انوار احمدی پریس، الہ آباد،ص ۳۶۔
۵۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۲۹۔
۶۔ https://ganjoor.net/hafez/ghazal/sh182
۷۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۱۲۹۔
۸۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۲۸۔
۹۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۱۳۷۔
۱۰۔ https://sufinama.org/persian-sufi-poetry/sahr-e-bulbul-hikaayat-baa-sabaa-kard-hafiz-persian-sufi-poetry?lang=ur
۱۱۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۲۵۰۔
۱۲۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۲۶۵۔
۱۳۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۲۵۶۔
۱۴۔ ہندوستانی زبان شمارہ ۱، بمبئی، اکبرالہٰ آبادی نمبر، عنوان مضمون، اکبرالہٰ آبادی کے فارسی کلام کا تجزیاتی مطالعہ از علی بیات، مارچ ۲۰۲۲،ص ۴۵۔
۱۵۔ ہندوستانی زبان شمارہ ۱، بمبئی، اکبرالہٰ آبادی نمبر، عنوان مضمون، اکبرالہٰ آبادی کے فارسی کلام کا تجزیاتی مطالعہ از علی بیات، مارچ ۲۰۲۲،ص۱۰۰۔
۱۶۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۳۳۰۔
۱۔ کلیات اکبر، سید اکبر حسین اکبرالہٰ آبادی، اے ون آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۱،ص۹۲۱۔

گاندھی نامہ:اکبر کے بہانے گاندھی کے تقاضے

اکبر کے وقتوں میں دوتہذیبوں اور تمدنوں کا آپس میں خاصا ٹکراو تھا۔مشرق کی پرانی تہذیب اور مغریب کی نئی تہذیب سے ہندوستان آتی ہوئی نئی تہذیب،اسی میں اسلام اور عیسایت کا سیاسی اور مذہبی جھگڑا بھی شامل ہو گیا۔انگریز ہندوستان کو پوری طرح سے اپنی عملی سیاست،تہذیبی اور معاشرتی شکنجوں میں جکڑنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔اکبر اس بڑھتے ہوے سیلاب کو روکنے کی کوشش میں لگے تھے۔کیونکہ یہ بات وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ صورت اگر ہندوستان میں پیدا ہو جائے گی تو سماج ومعاشرے میں ایک طرح کی ابتری کا پیدا ہو جانا لازمی سا ہوگا۔کیونکہ انگریز صرف سیاسی طور پر قابض ہونا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ آہستہ۔آہستہ ہندوستانی تہذیب اور طور طریقوں کو بھی بدل دینا چاہتے تھے۔اکبر کو انھیں سب کا خطرہ تھا۔بقول پروفیسر سید محمد عقیل رضوی:

" ایک طبقہ کو اپنی مذہبی روایات و اعتقادات کے باطل اور شکست ہونے کا غم پریشان کر رہا تھا تو دوسرے کو اپنی محکومی،اقتدار کے خاتمے کا رنج تھا۔کچھ ایسے لوگ تھے جو روشنی پر تاریکی اور جہالت کو دانشمندی پر ترجیح دے رہے تھے۔مگر کچھ ایسے بھی تھے جو کسی حد تک نئی روشنی سے متاثر بھی ہو رہے تھے۔اس طبقے کے افراد انگریزی تعلیم، انگریزی خیالات اور نئے نظام کی قدر و قیمت کو تسلیم کرنا ہندوستانی عوام کے لئے مستحن خیال کرتے تھے۔اکبر پہلے طبقے کے سب سے بڑے حامی اور نقیب تھے۔"

غرض کہ اکبر نے کسی بھی طرح سے اپنے شعور اور دل میں چھپے تضاد اور کشمکش کو چھپایا نہیں بلکہ ہر طرح سے اس کا اظہار بھی کیا۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

''اکبر نے گاندھی نامہ اپنے زندگی میں شایع نہیں کیا۔قمرالدین کا بیان ہے کہ اکبر کہتے تھے کہ میں انگریزوں کی مخالفت کھل کر کروں تو یہ بےاثر اور نقصان دہ بات ہوتی انھوں نے قمرالدین سے ایک بار کہا۔

جب میرا یقین ہے کہ حکومت سے کھل کر لڑنا نقصان دہ ہے تو بھلا میں کیا کہوں اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے؟ زندگی کے آخری دنوں (۱۹۲۱) میں اکبر نے قمرالدین احمد سے کہا:

لوگوں کا خیال ہے، میں اپنی پینشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا۔یہ غلط ہے۔اگر آج میں روپیوں کی خاطر قوم کا کام کروں تو کیا مجھ کو پینشن سے زیادہ فایدہ نہ ہو۔۔۔؟ دو باتوں سے گھبراتا ہوں۔ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے کے خیال سے ،دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرنسالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مسائب اٹھا سکوں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبر اپنی دل کی بات پوری طرح سے گاندھی نامہ میں کہتے نظر آتے ہیں۔''

گاندھی نامہ کی شروعات ہی اس انداز سے کرتے ہیں:

انقلاب آیا نئی دنیا، نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے

یہ اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اب نئی دنیا ان نئے تقاضوں کے ساتھ داخل ہو رہی تھی اب یہ ختم ہونے والی ہے،غرض کہ فردوسی کا شاہنامہ اسکی بہترین مثال ہے،(فردوسی فارسی کا مشہور شاعر ہے اور اس کی کتاب شاہنامہ کو مقبولیت کا درجہ حاصل ہے) شاہنامہ میں ملک پر زبردستی قبضہ کرنے والوں کا ذکر ہے،اور اب دور گاندھی نامہ ہے،کیونکہ گاندھی کے دور میں عام لوگوں کی باتیں،ان کے مسائل،انکی بہتری کی فکر کی جانے لگی تھی اور یہی باتیں عوام کو اپیل بھی کرتی تھی۔سچ بات تو یہ ہے کہ اکبر نے اپنے دور،سماج اور عام آدمی کی باتوں کو گاندھی میں تلاش کی اور گاندھی کے

ڈاکٹر طاہرہ پروین،اسیسٹینٹ پروفیسر اردو ایس ایس کھنہ گلس ڈگری کالج الہ آباد

مقصد کو پروان چڑھانے اور دوسری قوم کو اپنے ملک سے بے دخل کرنے کی باتیں گاندھی نامہ میں پیش کر ہی دیا۔

لشکر گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں ، مگر بے انتہاں صبر و قناعت چاہیے

اکبر گاندھی جی کے راستے میں آئی ہوئی دشواریوں اور ان سے نجات پانے کے راستے بھی بتاتے چلتے ہیں کہ جو لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ان کو ہتھاروں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ صبر وقناعت کی ضرورت ہے یہی ہندوستانیوں کی ترقی کا راستہ بھی ہے اور اپنے اگلے اقدام کی طرف گامزن ہونے کا زینہ بھی ہے۔

گاندھی جی کے ساتھ الگ۔الگ فرقے موجود ہیں کچھ گاندھی کے ساتھ تھے اور کچھ گاندھی کے ساتھ نہیں تھے۔ ہندو۔مسلم اپسی اختلاف کے بعد بھی گاندھی کے ساتھ مسلمانوں کا بھی ایک فرقہ موجود تھا،لیکن اس آپسی اختلاف اور ان کا ایک ہونا ان سب کو لے کر شاعر پریشان بھی ہے۔ گاندھی جی کو کئی طبقوں کا سامنا کرنا پڑا تھا،جس میں ہندو۔مسلم، کچھ گاندھی کے ساتھ تھے کچھ گاندھی کے ساتھ نہیں تھے۔صاف طور پر اقرار اور انکار کی صورت صاف نہیں نظر آتی تھی۔ یہ سب باتیں سماج کے ہر پہلو کو اجاگر کرتی ہے،کہیں سیاست،کہیں سرمایہ دار، جاگیردار اور مغربی تہذیب وتمدن کے طور طریقوں کو جہاں تک ممکن ہو سب بھنانے میں لگے تھے تبھی اکبر کہتے ہیں۔

اختلافوں کے مہیا ہیں جب امکان اتنے
متفق ہو نہیں سکتے کے مسلمان اتنے
ہوتیزئی انور کی جو ہوس ہنگامہ کرو توپوں سے بھنو
رگاندھی کی جو حکومت آے چپ چاپ گزی کے تھان بنو
صاحب کی رفاقت ہو جو پسند آسام میں جا کے چائے چنو
اکبر کی جو مانو بیٹھ رہو جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو اور احمد خدا کے گیت سنو

غرض کہ اکبرالہ آبادی کی شاعری دراصل طنز ومزاح کی شاعری تو تھی ہی لیکن اس کے پس پردہ جس بات کو لے کر اکبر پریشان تھے وہ سماج میں مشرقی تہذیب وتمدن کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے طنز ومزاح کے ذریعے اصلاح کو اپنا ہتھیار بنایا۔جس سے عالم انسانیت بھی متاثر ہو سکے گی اور لوگوں میں اصلاح کا جذبہ بھی بیدار ہوگا بقول احتشام حسین:

''مشاہدے کی سچائی اور ادراک حقیقت کے تضاد کی اتنی دلچسپ مثال اکبر کے سوا شاید ہی اقبال کے یہاں مل سکتی ہے۔''

اس طرح اکبر گاندھی نامہ کے ذریعے یہ بھی بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ گاندھی کے دور میں بھی لوگوں نے اپنے۔اپنے طرز طریق اپنائے۔اکبر الہ آبادی کی نظم گاندھی نامہ بدلتی ہوئی دنیا میں نہ صرف ایک ہتھیار کا کام کر رہی تھی بلکہ دونوں قوموں کو ملانے، سچ ہی کی راہ میں چلنا اور سرمایہ داروں سے بیدار رہنے اور فاصلوں کو کم کرنے کے لیئے شاید گاندھی نامہ سے بہترین کوئی نظم نہیں ہوسکتی۔ اکبر اور ان کی شاعری دونوں انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمان ہے۔۔انسانی زندگی کے مسائل الگ۔الگ ہیں۔دکھ۔سکھ سب زندگی میں آتے ہیں پیمانے جداگانہ ہوتے ہیں۔ان سب کو آپس میں ایک ہونے کے لیے عمل پیرا ہیں:۔

ہمارے ملک میں سر سبز اقبال فرنگی ہیں
کہ نان کاپریشن میں بھی شاخ خانہ جنگی ہیں

اکبر یہاں پر یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی اب انگریز نما لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔جو نہ ہی مدد کرتے ہیں کسی طرح سے ملک کے لیے۔اور آپس میں ہی

لڑتے نظر آتے ہیں۔اور شاعر کو افسوس ہے کہ گاندھی کے انویایوں(Anuyaiyo) میں ایسے لوگ بھی آگئے ہیں یہ فکر کی بات ہے اور آگے کہتے ہیں:۔

مدخولہ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کے گوپیوں میں

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو خاک راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

یہاں پر شاعر نے "مدخولہ گورمنٹ" لفظ کا استعمال کیا ہے۔اکبر کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح سے لوگ گاندھی جی کے ساتھ ہیں میں بھی گاندھی جی کے ساتھ ہونا چاہتا ہوں، مگر میں سرکار کا ملازم ہوں، اس لیے کھل کر گاندھی کی کی تحریک میں کوئی مدد نہیں کرسکتا۔اکبر کی نظر میں گاندھی کے چاہنے والوں کی بڑی اہمیت ہے اور اس اہمیت کو" کرشن" اور" گوپیوں" سے تشبیہ دی ہے۔اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ گاندھی جی کرشن اور ان کے چاہنے والی" گوپیاں" یہاں پر لفظ" گوپیاں "لاکر کرشن جی کی بھگتی کی طرف اشارہ ملتا ہے، جیسے کرشن کی گوپیاں کرشن کی لیلا میں مگن رہتی تھیں گویا اکبر اگر جج کے عہدے پر نہ ہوتے تو گاندھی کے چاہنے والوں میں ان کا بھی نام ہوتا۔اسی کے ساتھ "بدھو میاں" کا اکبر نے جو اشارہ کیا وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود اکبر الہ آبادی ہی ہیں اور مسلمان جو مٹھی ہیں، انکی تعداد کم ہے مگر گاندھی کے ساتھ ہیں۔

بدھو کا لفظ تھا فقط اک مصلحت کی بات
دل میں میرے نہاں ہیں جو اس اصلیت کی بات

غرض کی گاندھی نامہ سے متعلق جو کچھ بھی اپنی شاعری میں بیان کیا ہے، بیان نہیں بلکہ ان کے دور کی روزمرہ زندگی کی حقیقتیں تھیں جن کا وہ مشاہدہ کرتے رہتے تھے۔ہم ان کو اس طرح حالات سے نہ جوڑیں، لیکن اکبر کی شاعری (اور خاص طور پر) ان حالات اور اس دور کی زندگی کو سمجھنے میں ہماری خاصی مدد کرتی ہے، لیکن زندگی تو آگے بڑھتی ہی رہتی ہے شاعر اس کے ارتقا کی حقیقتوں سے اتفاق کرے یہ نہ کرے اور یہی اکبر کے ساتھ ہوا بھی۔بقول پدمشری شمس الرحمٰن فاروقی:۔

پچھلے تیس۔پینتیس برسوں کے تجربے اور پڑوسی ملک کے حالات کی روشنی میں اتنا تو ہمیں کرنا ہی چاہیے کہ ہم اکبر کے فکر و خیال پر بھی نظر ڈالیں اور ان کی تہذیبی سوجھ۔بوجھ سے سیکھا کریں۔اکبر کے اور کلام کو ہم بیکار اور آج کے حالات میں بے معنی قرار (کسی مطلب کا نہیں) دے بھی، لیکن گاندھی نامہ کے بارے میں یہ حکم نہیں لگ سکتا۔کیا وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں اور استادوں اور سیاسی تاریخ لکھنے والوں نے گاندھی نامہ کو نظر انداز کر دیا؟ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ جب تک زندہ ہے اور گاندھی کا نام جب تک زندہ ہے، اس وقت تک گاندھی نامہ بھی با مطلب رہے گا۔گاندھی نامہ کوئی معمولی، سادہ، خوب لڑی مردانی وہ تو جھاسی والی رانی تھی، قسم کی نظم نہیں ہے۔یہ الگ نظموں کا مجموعہ ہے۔اور اس کی سیاست اور تہذیبی گہرائیاں بہت مشکل اور دیر سے سمجھ میں آنے والی ہیں۔یہ محض سامان، اکہرا، قوم پرستانہ کلام نہیں ہے۔گاندھی نامہ پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ طنزیہ شاعری محض سیدھی اور سیدھے راستے والی شاعری سے زیادہ مشکل اور بہت الگ بھی ہوسکتی ہے۔سودیشی آندولن اور قومی بیداری، تحریک آزادی کی کامیابی اور انگریز کو پیچھے ہٹنے کے انجام ان سب پریشانیوں پر اشارے" گاندھی نامہ" میں ملتے ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ تمام تعریف اور تنقید کے باوجود اکبر کی شاعری کا رنگ اور اس کی معنویت نئے خیال کو جنم دیتی ہے، جو فکری محور ہمارے دل و دماغ میں پہلے سے موجود تھے اس کو ایک بار نئے سرے سے سوچنے، غور کرنے اور پھر سے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔یہی اکبر کا پیغام بھی ہے گاندھی کے نام، یہی اکبر کا گاندھی نامہ ہے۔

اکبر اقبال اورالہ آباد

انیسویں صدی کا نصف اول اور بیسویں صدی کا نصف آخر تاریخی سماجی اور سیاسی اعتبار سے بڑا ہی اہم اور افراتفری کا زمانہ ہے۔لیکن بیسویں صدی کے ربع اول کا زمانہ اکبر اور اقبال دونوں فنکاروں کی فکر ونظر کا محور بنا رہا۔اگر چہ اول الذکر فنکار اپنی عمر کا بیشتر حصہ گذار کر عالم جاودانی کے سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔آخر الذکر فنکار اپنی زندگی اور فن کے اعتبار سے عنفوان شباب پر تھا۔باوجود اس کے ان دونوں فنکاروں اور مفکروں نے ایک دوسرے کو پہچانا،ایک دوسرے کی شخصیت اور فکر وفن سے محظوظ بھی ہوے۔اکبر اور اقبال میں فنی مماثلتیں کم ہیں،لیکن مقاصد دونوں کے ایک ہی ہیں۔دونوں فنکار ایک دوسرے سے بہت زیادہ متاثر تھے۔اقبال کی والدہ محترمہ کے انتقال پر اکبر نے فارسی میں ایک تاریخی قطعہ لکھا جو مندرجہ ذیل ہے۔

مادر مخدومہ اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہاں بے ثبات
گفت اکبر با دل پر درد و غم
رحلت مخدومہ تاریخ وفات

ایک اردو نظم جس میں مادہ تاریخ کے علاوہ علامہ اقبال کے اوصاف حسنہ کو والدہ کی تربیت کا نتیجہ بتایا ہے اس کے چند اشعار دیکھیں:

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
اس کے شاہد ہیں کے ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے اہل دل تھے صاحب اسرار تھے

روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو
نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے
سال رحلت کا بیاں منظوراسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
''رحلت مخدومہ'' سے پیدا ہے تاریخ وفات

اس کے علاوہ بھی اکبر کے کئی اشعار خطوط اکبر میں اقبال کے سلسلے میں ملتے ہیں۔ان دونوں فنکاروں میں یک طرفہ محبت اور چاہ نہ تھی، بلکہ دوطرفہ تھی جسکا نتیجہ ہے کہ اقبال نے بھی اکبر کے سلسلے میں کچھ اشعار کہے ہیں۔اقبال اپنے مکتوب بنام نیاز الدین (۲۷ر جون ۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں۔

''....... ہاں آموں پر ایک لطیفہ یاد آ گیا گزشتہ سال مولانا اکبر نے مجھے لنگڑا آم بھیجا تھا، میں نے پارسل کی رسید اس طرح لکھی ہے:

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا''(۱)

اکبر کی ظریفانہ شاعری کے بارے میں اکبر کی وفات کے بعد اقبال نے نیچے کی لائنیں کسی وقت کہی ہے جس میں ان کے فن کو سراہا ہے:

نفیس عبدالحکیم،اسیسٹینٹ پروفیسر شعبۂ اردو،ایم۔پی ڈگری کالج،الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رک
قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کردیا متروک دلی کے زباں دانوں نے ٹک(۲)

علامہ اقبال نے اکبر کی وفات پر باقاعدہ ایک مرثیہ لکھا۔جس سے اکبر و اقبال کے گہرے تعلقات اور قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ مرثیہ اقبال کے فارسی مجموعہ کلام ''پیام مشرق'' کے پہلے ایڈیشن (۱۹۲۲) میں شامل تھا،مگر بعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا ہے۔مرثیہ کی چند لائنیں دیکھیں:

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر
حیاتش بحق بود روشن دلیلے
نوائے سحر گاہ او کارواں را
اذان درائے پیام رحیلے
دماغش ادب خوردہ عشق و مستی
دلش پرورش دادہ جبرئیلے (۳)

ایسا نہیں ہے کہ اکبر اور اقبال نے صرف ایک دوسرے کے بارے میں شعر ہی کہے ہیں بلکہ دونوں کے بیچ خط و کتابت کا سلسلہ بھی تھا نیز ایک دوسرے سے ملنے کے بہت زیادہ مشتاق بھی تھے۔اقبال کو اکبر سے وہی لگاؤ اور عقیدت تھی جو ایک پیر کو اپنے مرید سے ہوتی ہے۔۶/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اقبال اکبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''لاہور ۶/اکتوبر ۱۹۱۱ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ سید صاحب،السلام علیکم ___ کل ظفر علی خاں صاحب سے سنا تھا کہ جناب کو چوٹ آ گئی ہے۔اسی وقت سے میرا دل بے قرار تھا اور میں عریضہ خدمت عالی میں لکھنے کو تھا کہ آج جناب کا محبت نامہ ملا۔دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس تکلیف کو رفع کرے اور آپ کو دیر تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان کے مسلمان اس قلب کی گرمی سے متاثر ہوں جو خدا نے آپ کے سینے میں رکھا ہے۔

میں آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں ۔خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرف نیاز حاصل ہو اور میں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔

لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے.......''(۴)

اکبر اور اقبال میں رابطے کیسے پیدا ہوئے کتنی ملاقاتیں ہوئیں؟اس کی کچھ تفصیل ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنے مضمون 'اکبر پیش رو اقبال' میں بیان کیا ہے۔پروفیسر علی احمد فاطمی نے بھی اپنی کتاب 'اقبال اور الہ آباد' میں اقبال کے چار بار آنے کا ذکر کیا ہے۔چوتھی بار اقبال کی آمد جو مسلم لیگ کے جلسہ کے سلسلہ میں تھی اس کا ذکر تفصیل سے ہے۔اکبر سے اتنی محبت و عقیدت تھی کہ جب چوتھی بار اقبال تشریف لائے تو اپنے پیر کے مزار پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا ۔پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں''مفتی فخر الاسلام انہیں موٹر کار پر کالا ڈانڈا قبرستان لے گئے جہاں اکبر الہ آبادی ابدی نیند سو رہے ہیں علامہ نے قبر پر فاتحہ پڑھا ''۔(۵)

اقبال کی اکبر سے ملاقات کی دیرینہ خواہش آخر کار جنوری ۱۹۱۳ء میں پوری ہوتی ہے۔یہی اقبال کی اکبر سے پہلی ملاقات ہے۔اس ملاقات کے

بارے میں اکبر اپنے خط ۲۴؍جنوری ۱۹۱۳ء میں مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھ سے ملنے کو الہ آباد تشریف لائے تھے۔آپ صاحبوں کا کرم ہے نیک دلی ہے ورنہ میری کیا ہستی ہے:

چل بسے اسباب غفلت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

ڈاکٹر اقبال صاحب بلحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الٰہی میں سے ہیں۔آپ بجا ان کی مدح کی ہے۔وہ بھی نازاں ہیں کہ آپ ایسے عالم فلاسوفر، نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا''(۶)

اس خط سے اندازہ لگتا ہے کہ اقبال پہلی بار اکبر سے ملنے کی غرض سے جنوری ۱۹۱۳ء کی کسی تاریخ کو آئے ہوں گے۔ظاہر سی بات ہے کہ اکبر یہ خط ۲۴؍جنوری کو لکھ رہے ہیں۔جس میں ان کی آمد کو بتاتے ہیں تو اس سے دو چار روز پہلے یا ہفتہ عشرہ پہلے آئے ہوں گے۔جنوری سے پہلے نہیں آئے ہوں گے۔اس لئے کہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی کتاب اقبال اور الہ آباد میں ۱۹۱۳ء میں دوبارہ آنے کا ذکر کرتے ہیں۔جس میں پہلی بار جس کا ذکر کیا گیا اور دوسری بار کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اسی طرح اقبال کی دوسری آمد کا ذکر اکبر کے کچھ خطوط سے ہوتے ہیں۔اکبر ۹؍ستمبر ۱۹۱۳ء کو مرزا سلطان احمد کے نام لکھتے ہیں:

''پرسوں آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسہ کانپور (مچھلی بازار کانپور کے سانحہ مسجد کے مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں لاہور سے ڈاکٹر اقبال اور جلال الدین کانپور گئے تھے) مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے۔''(۷)

۱۰؍ستمبر ۱۹۱۳ء کو اکبر، عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''........کل ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے دہلی گئے''(۸)

مندرجہ بالا دونوں خط کو ملاتے ہیں تو اس کی تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ اقبال ۷؍ستمبر ۱۹۱۳ء سے ۹؍ستمبر ۱۹۱۳ء تک الہ آباد میں اکبر کے یہاں قیام کیا۔اس لئے کہ پہلا خط جو ۹؍ستمبر کو مرزا سلطان احمد کے نام ہے اس میں لکھتے ہیں کہ ''پرسوں''یعنی ۷؍ستمبر، دوسرا خط ۱۰؍ستمبر کو عبدالماجد دریابادی کے نام ہے اس میں لکھتے ہیں ''کل.....دہلی گئے''یعنی ۹؍ستمبر کو۔اس طرح ان دونوں خط سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ اقبال ۷؍ستمبر سے ۹؍ستمبر تک الہ آباد میں رہے

تیسری ملاقات ۲۹؍فروری ۱۹۲۰ء کو ہوتی ہے۔اس دفعہ اقبال تین دن الہ آباد میں اکبر کے مہمان رہے۔یہ ملاقات ۲۹؍فروری سے ۲؍مارچ تک رہی۔اکبر اپنے مکتوب ۲؍مارچ ۱۹۲۰ء میں عزیز لکھنوی کو لکھتے ہیں:

''مکرمی سلمہٗ اللہ تعالیٰ، تین دن سے ڈاکٹر اقبال صاحب میرے مہمان تھے۔ملنے آئے تھے کسی مقدمہ میں کسی ضلع میں گئے تھے۔آج رخصت ہوئے، آپ کا بھی ذکر خیر رہا۔میں ایک دن اچھا رہا تو چار دن بیمار اسی سبب سے اب تک نہیں اٹھ سکا۔''(۹)

اقبال کے الہ آباد آنے اور ملاقات کی اطلاع اکبر اپنے ایک اور مکتوب میں خواجہ حسن نظامی کو یوں دیتے ہیں:

''۲۹؍فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے کسی مقدمہ میں ضلع گیا کو گئے تھے۔مجھ سے ملنے کو اس طرف گزرے، تین دن رہے۔ان میں میں نے بہت پولٹیکل نشاط طبع پایا۔دنیا بہ امید قائم۔''(۱۰)

اسی ملاقات کے بارے میں اکبر اپنے ایک اور مکتوب ۱۹؍مارچ ۱۹۲۰ء میں عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال ملنے آئے تھے، تین دن رہ کر گئے۔کہتے ہیں میں آپ کے ساتھ رہتا تو ایک مجموعہ مرتب کرتا......''(۱۱)

الہ آباد کی گنگا جمنی سرزمین کو یہ شرف حاصل ہے کہ علامہ اقبال جیسی شخصیت اپنے پیر سے ملنے کے لئے تین بار تشریف لائی۔خطوط کے متن سے یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبال کی ان تینوں آمد میں سوائے اکبر کی زیارت کے اور کوئی بہانہ یا مصروفیت نہ تھی۔

چوتھی بار دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے جلسہ کی صدارت کے سلسلے میں تشریف لائے۔ چونکہ اکبر الہ آبادی کا انتقال ہو چکا تھا تو انہوں نے اکبر کے مزار پر حاضری دی جس کا ذکر شروع میں کیا گیا۔ مسلم لیگ کا یہ جلسہ پہلے پہل لکھنؤ یا بنارس میں ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے یہ جلسہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ جس کی اطلاع سید نذیر نیازی کو علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب یوں دیتے ہیں:

''........جلسۂ لیگ ملتوی ہو گیا ہے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ہوگا، غالباً لکھنؤ میں، یہ بھی ممکن ہے کسی اور جگہ ہو........'' (۱۲)

اس خط پر مرتب نے حاشیہ لگا کر لکھا ہے کہ ''یہی اجلاس بالآخر الہ آباد میں منعقد ہوا''

۱۱؍دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے الہ آباد کی آمد کا ذکر سید نذیر نیازی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

''لیگ کا جلسہ بنارس کی جگہ الہ آباد میں ہوگا۔ اس واسطے میں الہ آباد جاؤں گا، غالباً ۲۷؍دسمبر کو........'' (۱۳)

علامہ اقبال کی اس چوتھی آمد پر پُر جوش استقبال کیا گیا۔ پلیٹ فارم پر ایک جم غفیر علامہ کے استقبال اور دیدار کے لئے بیتاب تھا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''اس مجمع میں الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل کے طلباء اور مسلم وکلاء کی بھی اچھی تعداد تھی۔ شہر کے دیگر حلقے اور طبقے کے لوگ بھی موجود تھے۔ خواص و عام کی بھیڑ کے بے ہنگم دائرے اور نعروں کے بے ترتیب گونج میں علامہ رفتہ رفتہ اسٹیشن سے باہر آئے۔ مسلم ہاسٹل کے طلباء نے اپنے خیر مقدم کی غرض سے ایک تہنیتی نظم لکھی تھی اور پروگرام یہ تھا کہ اس نظم کا ہر شعر الگ الگ طالب علم پڑھے گا۔ طالب علموں کی پوری ٹیم ایک مخصوص انداز میں خوش آمدید کہے گی۔ لیکن غیر معمولی ہجوم نے سب کچھ منتشر کر دیا۔ اسی طرح اسلامیہ کالج کے طلباء نے شاعر مشرق کو کچھ تحائف پیش کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہ بھی دھرا رہ گیا۔'' (۱۴)

یہ تو تھیں علامہ اقبال کی اکبر سے چند ملاقاتیں اور ان کی الہ آباد کی آمد۔ تاہم اس کے علاوہ کچھ مواقع ایسے بھی آئے جس میں ان کی آمد اور ملاقات متوقع تھی لیکن کسی نہ کسی ناگزیر وجہ کی بنا پر الہ آباد کی سرزمین علامہ کی قدم بوسی سے محروم رہی۔ جن کی تفصیلات اکبر اور اقبال کے کچھ مکتوبات میں ملتی ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب یکم فروری ۱۹۱۸ء میں مہاراجہ کشن پرساد کو لکھتے ہیں:

''کل مولانا اکبر کا خط آیا تھا خوب شعر کہتے ہیں۔ انشاء اللہ میں بھی مارچ میں ایم۔اے۔ کا امتحان زبانی لینے کے لئے الہ آباد جاؤں گا اور مولانا کی ملاقات سے شرف اندوز ہوں گا۔'' (۱۵)

۹؍مارچ ۱۹۱۸ء میں محمد نیاز الدین خاں کو اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''.......چند روز میں ایم۔اے۔ کا زبانی امتحان لینے کیلئے الہ آباد جانے والا ہوں اور ممتحنی محض اس واسطے قبول کر لی کہ مولانا اکبر کی زیارت کا بہانہ ہو جائے گا۔'' (۱۶)

علامہ اقبال الہ آباد میں کس یونیورسٹی کے کس شعبہ میں زبانی امتحان لینے کے لئے آنے والے تھے اس کی تفصیل تو نہیں معلوم ہو سکی۔ لیکن اتنی بات تو طئے ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ممتحن آنے کا پروگرام نہیں رہا ہوگا۔ اس لئے کہ الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام ۱۹۲۴ء میں ہوتا ہے اور یہ بات ۱۹۱۸ء کی ہے۔

لیکن وقت اور حادثات زمانہ نے دغا دے دیا۔ مشرق کے ان دو عظیم فنکاروں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اسی دوران الہ آباد میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی۔ جس کی وجہ سے علامہ کے والد نے الہ آباد جانے سے منع کر دیا۔ اس سفر کے منسوخ ہونے کی خبر ۲۰؍مارچ ۱۹۱۸ء میں نیاز الدین خاں کو یوں دیتے ہیں:

''میں الہ آباد جانے والا تھا۔ مگر مولانا اکبر کے خط سے معلوم ہوا کہ وہاں پلیگ زوروں پر ہے۔ والد مکرم نے جو چند روز ہوئے

یہاں تھے۔ یہ خط دیکھ کر مجھے الہ آباد جانے سے روک دیا'' (۱۷)

اس طرح علامہ کے ایک دوسرے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک اور ملاقات اکبر سے دہلی میں ہونے والی تھی لیکن وہ بھی مولانا اکبر کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں ہوسکی۔ جب تک علامہ دہلی پہنچے، مولانا اکبر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے دہلی سے الہ آباد آ گئے۔

۹ر نومبر ۱۹۱۹ء میں نیاز الدین خاں کو علامہ اقبال اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''۲۳ر دسمبر کو دہلی جاؤ گا، وہاں سے ۲۵ یا ۲۶ کو واپس ہوتا ہوا ایک آدھ روز کے لئے آپ کی خدمت میں بھی ٹھہر جاؤ گا بشرطیکہ صحت اچھی رہی۔ سردی کا سفر میرے لئے مضر ہوتا ہے۔ مولانا اکبر دہلی میں ہیں اور آخر دسمبر تک قیام کریں گے۔ ان کی زیارت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ فقیر سید نجم الدین صاحب کے لڑکے کی شادی ہے۔ وہ اصرار کر رہے ہیں۔ اگر مولانا اکبر کی کشش نہ ہوتی تو فقیر صاحب سے معافی مانگ لیتا'' (۱۸)

علامہ اپنے دہلی کے سفر کے بارے میں مہاراجہ کشن پرساد کو ایک مکتوب ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں:

''.......مولانا اکبر آجکل دہلی کے حجرہ رین بسیرا میں مقیم ہیں۔ انشاء اللہ ۲۲ر دسمبر کو میں بھی ان کی زیارت کے لئے دہلی جاؤں گا ....اس کے علاوہ مولانا اکبر کی کشش دہلی کھینچ رہی ہے'' (۱۹)

انسان اپنی دنیاوی زندگی کے بہت سارے پروگرام بناتا رہتا ہے۔ جس میں سے کچھ ادھورے رہ جاتے ہیں اور کچھ پایہ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اکبر و اقبال کی بھی یہ ملاقات مشیت ایزدی کے سامنے دھری رہ گئی۔ جس کی بابت اقبال ۱۹ر دسمبر ۱۹۱۹ء میں نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:

''مولانا اکبر تو غالباً ۲۳ سے پہلے ہی الہ آباد چلے جائیں گے۔ کیوں کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں نے بھی ان کی زحمت کے خیال سے زور نہیں دیا کہ وہ دہلی میں میری آمد تک قیام فرمائیں۔'' (۲۰)

دو مفکروں اور دو ملی شاعروں کی باہمی ملاقات اور الہ آباد آمد کی مختصر سی روداد ہے۔ دونوں فنکاروں میں عقیدت اور محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ اکبر ایک باشعور فنکار تھے، اپنے سینے میں قومی و ملکی درد رکھتے تھے۔ اقبال بھی کم و بیش یہی درد رکھتے تھے۔ پیر رومی اور دوسرے مفکروں کی طرح اکبر کو پیر مشرق سمجھتے تھے نیز ان کی فکری رہنمائی کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے تھے۔

حواشی:

(۱) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۱ ص ۶۱۱

(۲،۳) باقیات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد صفحہ ۱۶۴

(۴) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۱ صفحہ ۲۲۶

(۵) اقبال اور الہ آباد، پروفیسر علی احمد فاطمی صفحہ ۲۲

(۶) اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ دوم ص ۳۷ بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۷

(۷) مکتوبات اکبر، بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۷

(۸) خطوط مشاہیر، بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۷

(۹) مکاتیب اکبر بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۸

(۱۰) خطوط اکبر ص ۱۶۳، بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۸

(۱۱) خطوط مشاہیر بحوالہ اکبر پیش رو اقبال ص ۱۳۸

(۱۲) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مطفر حسین برنی ج ۳ ص ۱۵۶

(۱۳) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۳ ص ۱۸۴

(۱۴) اقبال اور الہ آباد، پروفیسر علی احمد فاطمی ص ۱۲، ۱۳

(۱۵) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۱ ص ۱۰۷

(۱۶) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۱ ص ۲۰۷

(۱۷) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۱ ص ۲۰۷

(۱۸) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۲ ص ۱۴۷

(۱۹) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۲ ص ۱۵۸

(۲۰) کلیات مکاتیب اقبال، مرتب سید مظفر حسین برنی ج ۲ ص ۱۶۱

اکبرالہ آبادی کی شاعری: مشرقی تہذیب اور طنز ومزاح کا حسین امتزاج

اکبرالہ آبادی اردو ادب میں اپنی منفرد شاعرانہ صلاحیتوں کی وجہ سے طنزیہ ومزاحیہ شعرا میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی ولادت ۱۶/ نومبر ۱۸۴۶ء کو الہ آباد ضلع کے ایک گاؤں بارہ میں ہوئی۔ ان کی تعلیم گو کہ مشرقی طرز پر ہوئی لیکن انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے انگریزی زبان میں بھی اچھی لیاقت حاصل کرلی۔ پھر عدالت سے وابستہ ہوکر ملازمت کا آغاز کیا پھر وکالت بھی کی اور سشن جج کے عہدے پر فائز بھی ہوئے۔ اکبرالہ آبادی کی شعری حیات نصف صدی سے زائد عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ شاعری کو محض دل لگی یا ذوق کی تسکین نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ایک بامقصد اور بامعنی فن کی صورت میں برتتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر ایک ایسا مشعل تھا جو انسانی زندگی کو راستہ دکھائے اور قوم کو فلاح و بہبود کے صحیح رستے پر لے آئے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں محض حسنِ بیان یا خیال آفرینی نہیں بلکہ ایک واضح مقصدی رنگ جھلکتا ہے۔ اکبر نے بازاری شاعری اور روایتی مضامین سے دامن بچایا اور اپنے لیے ایک نیا میدان منتخب کیا۔ ان کی فطری انفرادیت اور جدت طرازی نے اردو شاعری کو ایک نیا ذائقہ اور نیا جوش عطا کیا۔

اکبر کی ذہنی کیفیت اور ادبی ذوق کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ لفظوں کے ساتھ کھیلنے کا غیر معمولی ہنر رکھتے تھے۔ چوں کہ زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل تھی اس لیے انھوں نے عام بول چال کی زبان میں انگریزی زبان کا ایسا برجستہ استعمال کیا کہ اس سے مزاح نگاری کا لطف دوبالا ہوگیا۔ خصوصاً انگریزی زبان کے اس عہد میں رائج الفاظ کے ذریعے مغربی تہذیب کی ظاہر پرستی اور اندھی تقلید کرنے والوں پر انھوں نے اپنی تنقید کا نشانہ کسا اور انگریز پرست ہندستانیوں پر بھرپور چوٹیں کی۔ پنڈت کشن پرشاد کول ان کی انگریزی اور ہندی کے الفاظ کو اشعار میں کھپانے کی کوشش کی سراہنا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اکبر کو غیر مانوس لفظوں بالخصوص انگریزی اور ہندی کے لفظوں کو شعر میں
> کھپانے اور نباہنے کا کچھ ایسا سلیقہ تھا اور یہ بھی طنز وظرافت کے رنگ اور زمین میں کہ لفظ لفظ نہیں رہ جاتے بلکہ نگوں کی طرح چمکنے لگتے تھے کہ جو مرصع کار کا کام ہو''

آگے لکھتے ہیں:

> ''اکبر کے کلیات کی جلدوں میں پچاسوں اشعار ایسے ہیں جن سے انکی شاعری کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان کی زندہ دلی اور ظرافت کی شوخیاں جھلکتی ہیں اور ان کے بے پناہ طنز کے نشتر چمکتے ہیں۔''

(پنڈت کشن پرشاد کول، اکبرالہ آبادی اور ان کی شاعری علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جامعہ ملیہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص ۴۱، ۴۰)

اکبر نے لفظوں کے الٹ پھیر سے بھی مزاح پیدا کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہات محاوروں، ضرب الامثال، لفظوں کے الٹ پھیر لفظوں کی تکرار اور صنعتوں کے عمدہ اور خوبصورت استعمال سے ظرافت کی پھلجھڑیاں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار بطور مثال دیکھیے:

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اس کو کالج اور اُسے کانوکیشن سمجھو

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کی پڑ گیا

الگ ہے شخصیت حوادث، ہمیں سے یا وہ اُبھر رہے ہیں
یہ وقت ہم پر گزر رہا ہے کہ وقت پر ہم گزر رہے ہیں

عبدالحافظ فاروقی، علیگ لکھنو

دریا میں کیوں رہو کہ مگر سے ہو سابقہ
لیکن رہو تو چارہ ہی کیا بیر کے سوا
مہاتما جی سے مل کے دیکھو، طریق کیا، بھاؤ کیا ہے
پڑی ہے چکر میں عقل سب کی، بگاڑ تو ہے، بناؤ کیا ہے
خوب وہ و دکھلا رہے ہیں سبز باغ
ہم کو بھی کچھ گل کھلانا چاہیے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کر
خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکپ کے جمپ کے
اس کو نہ خبر کچھ اُس کی ہے اُس کو ہے نہ کچھ پروا اس کی
روتا ہے رلائے جاتا ہے، ہنستا ہے ہنسائے جاتا ہے
دنیا کا ذرا یہ رنگ تو دیکھ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے
بن بن کے بگڑتا جاتا ہے اور بات بنائے جاتا ہے
ڈنر کا مجھ کو نہیں چسکا وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا
شراب ہوگی، کباب ہوں گے حضور عالی جناب ہوں گے

اکبر کا نام آتے ہی طنز ومزاح کی پوری ایک کائنات سامنے آجاتی ہے۔اگر چہ جعفرزٹلی اور سودا کے یہاں اس صنف کی جھلک ملتی ہے لیکن اکبر نے اسے جس وقار اور بلندی تک پہنچایا، وہ انہی کا حصہ ہے۔ان کے طنز کی بنیاد محض تمسخر یا دل لگی نہیں بلکہ سنجیدگی اور فکر ہے۔وہ ہنسی کے پردے میں ایسی گہری بات کہہ جاتے ہیں جو براہ راست کہنے سے شاید نا قابل قبول ٹھہرتی۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین اکبر کی شاعری کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اکبر نے اپنے شعور یا محسوسات کو جس عنوان سے پیش کیا وہ اردو میں اس سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھا۔اس سے پہلے کی تمام شاعری کا جائزہ لے لیجئے تو بھی یہی معلوم ہوگا کہ ظریفانہ شاعری ہجو کے علاوہ کسی اور شکل میں کسی خاص اہمیت کے ساتھ نہیں ملتی۔ غزل،قصیدہ، وغیرہ میں بھولے بھٹکے مزاح تمسخر یا پھبتی وغیرہ کا کوئی جز کہیں مل جاتا ہے مگر وہ تو تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور نہ اس لطافت کے ساتھ جو اکبر نے پیش کیا ہے۔۔۔وہ ظرافت کو ایک خاص اہمیت اور روک تھام کے پیش کرنا چاہتے تھے کیوں کہ محض تفریحات کے خانہ میں نہیں ڈال دینا چاہتے تھے بلکہ کسی خاص مقصد براری کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔''
>
> (سید اعجاز حسین، اکبر فنکار کی حیثیت سے علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، ۱۹۵۰، ص ۵)

اکبر کا عہد وہ زمانہ تھا جب مشرقی معاشرہ مغربی تہذیب کی یلغار سے دوچار تھا۔نئی تعلیم اور مغربی اثرات نے معاشرتی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اکبر نے اس بدلتی ہوئی فضا کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان کے کلام میں مشرقی تہذیب کے وقار کی جھلک اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں پر طنزیہ تبصرے کثرت سے ملتے ہیں۔

اکبر نے طنز ومزاح کو محض سطحی مشغلہ نہیں بنایا بلکہ اسے ایک فنکارانہ بلندی پر پہنچایا۔وہ معنی آفرینی کے ساتھ ساتھ تمثیل اور استعارات کو بھی اس خوبصورتی سے برتتے ہیں کہ ان کا ہر شعر ایک نئی دنیا آباد کر دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد آنے والے شعرا نے انہی کی پیروی کی۔اکبر کے مشہور قطعہ''

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں'' سے متاثر ہو کر اقبال نے لڑکیوں کی انگریزی زبان سے دلچسپی پر طنزیہ وار یوں کیا ہے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روش مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اکبرالہ آبادی نے غزل اور قطعہ دونوں ہی اصناف کو طنز و مزاح کے اظہار کے لیے برتا لیکن قطعہ ان کے ہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔انہوں نے قطع کو طنزیہ شاعری کا سب سے موثر ہتھیار بنا دیا۔وہ غزل کی رمز و ایجاز کو بھی اپنے کلام میں شامل کرتے ہیں، لیکن جب بات طنز کی آتی ہے تو قطعے میں ان کا زور قلم اور بھی بڑھ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بعد آنے والے طنزیہ شعرا نے انہی بیٹوں کو اپنایا اور ان کے رنگ کو آگے بڑھایا۔

اکبر کے طنز کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض ظرافت پر قناعت نہیں کرتے بلکہ اصلاح کا جذبہ بھی ان کے کلام میں شامل ہوتا ہے۔ان کے طنزیہ قطعات اور اشعار میں قوم کو جھنجھوڑنے کا ایک واضح ارادہ کارفرما ہے۔وہ جدید تعلیم نسواں کی آزادی مغربی تہذیب اور سیاست کی منافقت پر ایسے انداز میں تنقید کرتے ہیں کہ سننے والا مسکرا کر بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

بعض ناقدین نے اکبر کو جدید تعلیم کا مخالف بتایا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ اس تعلیم کے خلاف تھے جو انسان کو مادہ پرست اور دین و اخلاق سے بیگانہ بنا دے۔وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کے ساتھ اخلاقی اور مذہبی تربیت کو بھی لازمی سمجھا جائے۔ان کی نگاہ میں وہی تعلیم باعثِ فلاح ہے جو انسان کو عملی زندگی میں سنجیدگی، دیانت اور تہذیبی وقار عطا کرے۔

جدید تعلیم کے متعلق اکبر کا نقطہ نظر مندرجہ ذیل اشعار سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس اک سخن بندہ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اس کی حقیقت کو نہ بھولو
افلاک تو اس عہد میں ثابت ہوئے معدوم
اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک
ہم فلسفہ کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے
ہوشیار رہ کے پڑھنا اس جال میں نہ پڑنا
یورپ نے یہ کہا ہے یورپ نے وہ کہا ہے
ماں باپ سے شیخ سے اللہ سے کیا کام انکو
ڈاکٹر جنوا گئے تعلیم دی سرکار نے
میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے

اس چٹائی پر نمازیں پڑھیں حسب دستور
چھوڑیئے آپ یہ ہنگامہ تعلیم جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خداوند غفور
بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

اکبر کے کلام میں مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک کے خلاف ایک مسلسل مزاحمت نظر آتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ تہذیب بظاہر دلکش ہے مگر اس کی تہہ میں روحانیت سے انکار اور مادیت پرستی چھپی ہے۔ ان کے اشعار میں بار بار یہ خیال ابھرتا ہے کہ اگر قوم نے اندھی تقلید کی روش اختیار کی تو اس کی تہذیبی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی سچ ہے جتنی اکبر کے دور میں تھی۔ صارفیت اور مغرب پرستی کی وہ لہر آج بھی ہمارے معاشروں میں دکھائی دیتی ہے، اور یہی اکبر کے کلام کی تازگی کی دلیل ہے۔

اکبر نے پردے کے معاملے میں بھی اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔ وہ مغرب زدہ عورتوں کے فیشن اور طور طریقوں کو مشرقی معاشرت کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کے مشہور قطعے ''بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں'' میں وہ اسی سماجی بگاڑ پر گہری طنزیہ چوٹ کرتے ہیں۔
اس جیسے چند دیگر اشعار کو دیکھئے۔

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں
بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی اسکول میں
بی بی جو طرز مغربی ہو تو کہو
احسان ہے یہ جو مجھ کو شوہر سمجھو

اکبر الہ آبادی کی شاعری محض تفنن طبع یا وقتی دل لگی نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ ہے۔ ان کے کلام میں انیسویں صدی کے آخری برسوں اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی پوری تصویر جھلکتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، مذہبی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری اس دور کی فضا میں کھو جاتا ہے۔ ان کے اشعار میں جہاں ہنسی کے قہقہے بکھرتے ہیں، وہیں ایک گہری فکر بھی جنم لیتی ہے۔ یہی امتزاج ان کے فن کو زندہ جاوید بناتا ہے۔

اِکبر نے اپنی زندگی کو قوم کے درد و کرب کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ وہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کو زہر قاتل سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ اپنی تہذیبی بنیادوں کو نہ بھولیں۔ ان کے نزدیک اگر ترقی کا مطلب مذہب، اخلاق اور مشرقی اقدار سے دوری ہے تو ایسی ترقی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو جدید علم ضرور حاصل کرنا چاہیے لیکن اپنے دین و اخلاق کی روشنی میں۔

اکبر کے طنز کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اصلاح کی نیت سے کیا گیا طنز ہے۔ ان کے اشعار میں ریاکاری، خودغرضی، سیاست کی منافقت اور مغربی طور طریقوں پر چوٹ تو ہے لیکن ساتھ ہی اس کے پس منظر میں ایک سنجیدہ مقصد بھی کارفرما ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم جاگے، اپنی حقیقت پہچانے اور اندھی تقلید کے بجائے اپنی تہذیبی شناخت کے ساتھ آگے بڑھے۔

ان کے کلام کی تازگی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ آج کے زمانے میں بھی اتنے ہی معنی خیز ہیں جتنے اپنے عہد میں تھے۔ آج بھی معاشرہ مادیت، صارفیت اور مغربی اندازِ فکر کے حصار میں ہے۔ اکبر کے اشعار آج بھی ہمیں جھنجھوڑتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ اپنی اقدار کی حفاظت کیسے بغیر ترقی محض ایک فریب ہے۔

اکبرالہ آبادی نے ایسے عہد میں آواز بلند کی جب لوگ مغربی تہذیب کو کامیابی اور ترقی کا ہم معنی سمجھنے لگے تھے۔اس ماحول میں ان کی شاعری ایک چراغ کی مانند تھی جو اپنی روشنی سے صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کراتی تھی۔ان کا دل اس صورتحال پر کڑھتا تھا کہ قوم اپنی بنیادوں سے کٹتی جارہی ہے،اس لیے انہوں نے شعروسخن کو اصلاح قوم کا ذریعہ بنایا اور اندھی تقلید کے خاتمے کے لئے کمر بستہ ہوئے۔لوگوں نے اکبر کی تضحیک پر قہقہہ لگایا لیکن اکبر کے طنز میں پوشیدہ تنقید واصلاح نے عوام کو احساس دلایا کہ ترقی مغرب کی چکا چوند میں اتنا اندھا نہیں ہونا ہے کہ انسان شعور وآگہی کو کھو بیٹھے۔اکبر ایک دور اندیش شخص تھے۔تغیر زمانہ سے لوگوں کو نئے انداز سے راستے پر لانے کے خواہش مند تھے اور اس کام کے لیے غزل یا تلخ نصیحت کی فرسودگی اور روایتی انداز سے اکبر آشنا تھے لہذا انہوں نے شاعری وہ طرز ایجاد کی جو ظاہری طور پر ظرافت وتمسخر مگر باطنی طور پر نصیحت وتنقید تھی۔

اکبر سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے جو ان کے خیال میں مغربی تہذیب کو سب کچھ سمجھ رہی تھی۔وہ مغرب کی اس تعلیم جدید سے خائف تھے جس سے روحانیت اور اخلاقیات کا درس نہیں ملتا بلکہ اس کی جگہ اخلاقی بحران،ذہنی غلامی،مادیت پرستی اور مذہب بیزاری جنم لیتی ہیں۔اکبر کے خیال میں چونکہ اخلاقی فساد میں کالج کی تعلیمات کا اہم رول ہے لہذا وہ کالج کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔اکبر ایسے فلسفے کا تمسخراڑاتے ہیں جس سے عقل پر موٹا پردہ پڑ جاتا ہے۔ان کے خیال میں مغرب،مشرق کا بدترین اور عیار دشمن ہے جو اپنے دلکش فریب سے قدیم تہذیبوں کو نگلنا چاہتا ہے۔تہذیب سے متعلق ذہنوں میں جاری یہ ایک خاموش جنگ ہے،مشرقی عقل وشعور جس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ان کے خیال میں تعلیم نسواں بھی اخلاقی بگاڑ کی بنیاد ہے۔

اکبر اس ترقی کے سخت مخالف ہیں جس کے سامنے انسان خدا اور اس کی عظمت فراموش کر بیٹھتا ہے۔اکبر مشرق ومغرب کے تصادم پر بھی تنقید کرتے ہیں۔اس تعلق سے اکبر کا ایک نظریہ ہے ان کی خواہش ہے کہ توحید سے کسی طور سمجھوتہ نہ کیا جائے لہذا وہ طرز مغربی ہی نہیں بلکہ اس کی تمام تر فکریات پر طنز وظرافت کا نشتر چلاتے ہیں۔اس تعلق سے اگر اکبر کے زاویہ نگاہ کا جائزہ لیا جائے تو اکبر حق بجانب نظر آتے ہیں کیونکہ مغرب کا فلسفہ زندگی ایسے نظریات پر قائم ہے جہاں دین ومذہب اور عقائد کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔دیکھیے اکبر مشرق ومغرب کے تصادم کا فلسفہ کس طرح پیش کرتے ہیں۔

الجھنا زلف مغرب میں دکھاتی ہے وہ دنیا
مگر دینی مقاصد میں ہزاروں پیچ پڑتے ہیں

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

بادہ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشہ تقوی کو کرو پاش پاش

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق مشرق و مغرب کا یارانہ
ادھر صورت فقیرانہ ادھر سامان شاہانہ

اکبر طرز مغربی کو نئی تہذیب،نئی روشنی اور نئے طریقے سے موسوم کرتے ہیں۔ان کے مطابق اس تہذیب کے خمیر میں مادیت ہے لہذا انسان کا انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔بلاشبہ اکبر کا اخذ کیا گیا نتیجہ آج بھی سچ ہے،صارفیت و مادیت مغربی تہذیب کے عناصر ہیں۔چونکہ اس تہذیب کی خیرہ کر دینے والی ظاہری چمک نے سب کو فریب دیا ہے لہذا لوگ اس حقیقت کو دیکھ نہیں پاتے ہیں۔اب نئی تہذیب وروشنی پر اکبر یوں طنز کے تیر چلاتے ہیں۔

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی پابندی نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت پر نیا کعبہ بنے گا مغربی پہلے صنم ہوں گے۔

نئی تہذیب کی مخالفت کرتے کرتے اکبر کالج اور یونیورسٹی کو بھی نشانہ بناتے ہیں اور اس کے محض منفی پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔اس دوران چونکہ سرسید جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں کوشاں تھے اس لئے اکبر سرسید اور علی گڑھ کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔حالانکہ ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ

اکبر کی طنز وظرافت کے پہلو میں اصلاح وتنقید کا جذبہ مضمر ہے۔

سنتا نہیں کسی سے کچھ بڑھ بڑھ کے سوا
کہتا نہیں کوئی کچھ پڑھ پڑھ کے سوا
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول بڑھنے کی نہ راہ
اور قبلہ کوئی نہیں علی گڑھ کے سوا

ایمان بیچنے پہ سب ہیں تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

طفل دل محوطلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آگئی مذہب کو فالج ہو گیا

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں اللہ نگہبان رہے

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ سبق دیا کہ ترقی کا مطلب اندھی تقلید نہیں بلکہ اپنی تہذیب واقدار کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہے۔ان کا کلام در اصل اس بات کا اعلان ہے کہ مشرق اپنی بنیادوں پر قائم رہ کر بھی ترقی کی راہیں نکال سکتا ہے۔انہوں نے اپنی زندگی کے ہر لمحے کو قوم کے نام کر دیا اور اپنے فن کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کی خدمت انجام دی۔ان کے کلام کا مطالعہ ہمیں محض شعری لذت نہیں دیتا بلکہ ایک پورے دور کی تاریخ سمجھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ وہ محض شاعر نہیں بلکہ اپنے زمانے کے فکری رہنما بھی تھے۔

ان کے اشعار میں طنز ومزاح کی چمک کے ساتھ ساتھ ایک سچی محبت اور دردمندی بھی کارفرما ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی تازہ محسوس ہوتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اسکو یوں میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی طنز وظرافت کے اس شاعر کا نام ہے جس نے اردو ادب میں ایک نئی راہ کھولی۔ان کے اشعار آج بھی سماجی اور تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں،اور ان کا پیغام آج بھی ہماری ضرورت ہے۔ان کی شخصیت اور فن اردو شاعری کے ایسے روشن باب ہیں جو آنے والے وقتوں میں بھی اپنی معنویت برقرار رکھیں گے۔

اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں مشرقیت اور قومیت

اکبر حسین، جو بعدازاں اکبرالہٰ آبادی کے نام سے اُردو دنیا میں شہرت یافتہ ہوئے، اُردو ادب میں طنز و مزاح کے بانی اور منفرد اسلوب کے شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۶ر نومبر ۱۸۴۶ء کو الہٰ آباد کے قریب بارہ (ضلع الہٰ آباد، موجودہ پرایاگ راج) کے ایک متوسط مگر معزز گھرانے میں ہوئی۔ اکبر کا اصل نام سید اکبر حسین تھا۔ وہ اُس دور میں پیدا ہوئے جب ہندوستان غلامی کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ہلچل نے پورے برِصغیر کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی ڈھانچے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اکبرالہٰ آبادی کے والد سید تفضّل حسین ایک معمولی سرکاری ملازم تھے اور خاندان کو محدود وسائل میں چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ اکبر نے ابتدائی تعلیم مقامی مکتب اور مدرسہ میں حاصل کی، جہاں انہیں فارسی اور عربی کا شوق پیدا ہوا۔ بعدازاں اُنہوں نے انگریزی تعلیم بھی حاصل کی اور عدالت میں ملازم ہوئے۔ یہیں سے اُن کی زندگی میں وہ تضاد پیدا ہوا جس کا عکس بعد کی شاعری میں بخوبی نظر آتا ہے۔ ایک طرف سرکاری ملازمت کا تقاضا اور دوسری طرف قومی و تہذیبی غیرت کا جوش۔ اکبر نے شاعری کا آغاز محض اٹھارہ برس کی عمر میں کیا۔ ابتدا میں اُن کے کلام میں روایتی غزل اور عشقیہ جذبات کا رنگ غالب رہا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے مزاج میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا ہوئی۔ وہ طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے اور اسے محض تفریح کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ سماجی اور قومی اصلاح کا ہتھیار بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں "لسان العصر" یعنی اپنے عہد کی زبان کہا گیا۔ اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں بیک وقت کئی جہتیں ملتی ہیں: طنز و مزاح کا دلکش پیرایہ، سماجی و تہذیبی اصلاح کی فکر، قومیت اور حب الوطنی کا جذبہ، اور مشرقی اقدار کا تحفظ۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں روزمرہ زندگی کے مسائل کو بڑی سادگی اور عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا طنز محض ہنسانے

کے لیے نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہی خصوصیت انہیں اپنے معاصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> ''اکبرالہٰ آبادی کا اصل کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی شاعری کو محض فن یا اظہارِ ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اپنے عہد کے فکری اور تہذیبی مسائل کے ساتھ جوڑ دیا۔ وہ مزاح کے پردے میں قوم کو بیدار کرتے ہیں اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔''
>
> (اکبرالہٰ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۸۳)

یوں اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کو محض طنزیہ شاعری کہنا اُن کے مقام کو گھٹانے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے ایک مصلح، قوم کے رہنما اور تہذیبی محافظ کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ 'اکبر کا عہد اور تہذیبی پس منظر' اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے عہد کے حالات پر نظر ڈالنا لازمی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر اور ۲۰ویں صدی کے اوائل کا ہندوستان سیاسی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے ایک بڑے بحران سے گزر رہا تھا۔ اکبر کی آنکھیں اس دور میں کھلیں جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے شعلے بھڑک چکے تھے۔ یہ بغاوت ناکام ہوئی لیکن اس نے ہندوستانی معاشرے پر گہرے زخم چھوڑے۔ مسلمانوں پر بالخصوص انگریزی حکومت کے شک اور انتقام کا نشانہ بنا۔ جاگیریں ضبط ہوئیں، تعلیمی ادارے برباد ہوئے اور سیاسی و سماجی ادارے مفلوج ہوگئے۔ اکبر نے ان حالات کو قریب سے دیکھا اور ان کا اثر اُن کی شاعری میں پوری شدت سے جھلکتا ہے۔ مغربی تہذیب کا سیلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے مغربی تعلیم اور تہذیب کو فروغ دیا۔ انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو سرکاری ملازمتوں میں ترجیح دی گئی۔ اس کے نتیجے میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا جسے "انگریزی خواں" کہا جاتا تھا۔ یہ طبقہ مغربی لباس، طور طریقے اور اقدار کو اپناتا جا رہا تھا۔ اکبرالہٰ آبادی نے اسی طبقے پر سب سے زیادہ طنز کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے ان کی اندھی تقلید کو ہدفِ تنقید بنایا۔ مغربی تہذیب کے دباؤ میں مشرقی اقدار جیسے پردہ، خاندانی نظام، مذہبی پابندیاں اور روایتی رسوم کمزور پڑنے لگیں۔ عورتوں کی آزادی، مغربی طرزِ تعلیم اور نئی تہذیبی روشنی نے پرانے نظام کو چیلنج کیا۔ اکبر ان تبدیلیوں کو محض اصلاح کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تبدیلیاں ہندوستانی قوم کی شناخت اور مشرقی تہذیب کے لیے

ڈاکٹر جاں نثار عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

خطرہ ہیں۔اکبر کے دور میں تحریکِ آزادی کے مختلف مراحل سامنے آئے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی، ہندو مسلم اختلافات بڑھنے لگے، تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔اکبر اگرچہ عملی طور پر اِن تحریکوں میں شامل نہیں ہو سکتے تھے(کیونکہ وہ سرکاری ملازمت اور پنشن یافتہ تھے)،لیکن اُن کی شاعری میں ان سیاسی حالات کا عکس جگہ جگہ نظر آتا ہے۔اُن کے طنز میں برطانوی حکومت کی مخالفت بھی جھلکتی ہے اور اپنی قوم کو بیدار کرنے کی کوشش بھی۔جیسا کہ ڈاکٹر فصیح ظفر لکھتے ہیں:"اکبرالہٰ آبادی نے اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی تضادات کو طنز و مزاح کے پیرایہ میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اُن کے کلام کو پڑھتے ہوئے پورے عہد کا منظر نامہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔'

'(اکبرالہٰ آبادی:ایک سیاسی وسماجی مطالعہ،ص۱۲)

اکبرالہٰ آبادی کی شاعری کا سب سے نمایاں پہلو مشرقی تہذیب کے تحفظ اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر تنقید ہے۔انہوں نے اپنے کلام میں اس بات کو بار بار اُجاگر کیا کہ قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اپنی تہذیبی اقدار، دینی روایات اور اخلاقی اصولوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا جائے۔اُن کی نظر میں مغرب کی تقلید ہندوستانی قوم کے لیے زہرِ قاتل تھی۔اکبر کے طنز کی تیز دھار نے خاص طور پر انگریزی تعلیم، مغربی تہذیبی رجحانات، عورتوں کی آزادی اور پردے کے خاتمے کو نشانہ بنایا۔اُن کی شاعری میں یہ تمام پہلو نہایت باریکی سے ملتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی معاشرے میں مغربی اثرات تیزی سے پھیلنے لگے۔نئی نسل انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کر کے مغربی لباس، رہن سہن اور طور طریقے اپنانے لگی۔اکبر نے اِس صورتحال کو نہایت تلخی کے ساتھ محسوس کیا اور اپنی شاعری میں اس کی تصویر کشی کی۔وہ بار بار کہتے ہیں کہ ہندوستانی نوجوان اپنی روایات کو چھوڑ کر مغرب کی تقلید میں کھو گئے ہیں۔ ان کا یہ شعر اسی رویے پر ایک طنزیہ تبصرہ ہے:

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھوٹ گئے

یہ شعر صرف طنز نہیں بلکہ ایک فکری المیہ ہے۔اکبر کا درد یہ تھا کہ قوم کے نوجوان اپنی شناخت کھو کر ایک ایسے راستے پر نکل پڑے ہیں جو نہ انہیں مغربی بننے دیتا ہے اور نہ مشرقی رہنے دیتا ہے۔پروفیسر نورالرحمٰن اس بارے میں لکھتے ہیں:

"اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں مغربی تہذیب کی مخالفت دراصل مشرقی قدروں کی بقا کی جستجو ہے۔وہ سمجھتے تھے کہ اگر قوم نے اپنی تہذیب اور مذہب کو چھوڑ دیا تو نہ صرف اس کی اخلاقیات بگڑ جائے گی بلکہ اس کی قومی وحدت بھی ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔

(اکبرالہٰ آبادی اور ان کا کلام،ص۱۰)

اکبر کے اشعار پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ایک قدامت پسند نہیں تھے، بلکہ انہیں قوم کے اخلاقی اور روحانی مستقبل کی فکر تھی۔اکبر مغربی طرزِ تعلیم کو بڑی احتیاط سے دیکھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ یہ تعلیم نوجوانوں کو اپنی مذہبی جڑوں سے کاٹ دیتی ہے اور انہیں مغربی تہذیب کی نقالی پر مجبور کرتی ہے۔انہوں نے بارہا اس تعلیم پر طنز کیا:

اجسام کے فنون کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس

یہاں اکبر کا اشارہ مغربی تعلیم کے یکطرفہ پن کی طرف ہے کہ وہ محض مادی ترقی پر زور دیتی ہے اور رُوحانی اقدار کو نظرانداز کرتی ہے۔اسی طرح اکبر نے مغربی اثرات کے زیرِ سایہ خواتین کی آزادی اور پردے کے خاتمے پر بھی شدید طنز کیا۔اُن کے نزدیک عورت کی بے پردگی مشرقی معاشرے کی اخلاقی بنیادوں کو متزلزل کر دے گی۔اُن کا مشہور شعر ہے:

بے پردہ نظر آئی جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

یہ شعر محض عورتوں کی آزادی پر طنز نہیں بلکہ اس عہد کے اس تضاد کی نشاندہی بھی ہے جہاں مرد مغرب کی اندھی تقلید میں اپنی قدروں کو چھوڑ بیٹھے تھے۔ اکبر کی یہ فکر دراصل اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ معاشرتی تبدیلیوں کو محض سطحی ترقی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کے دوررس اثرات پر غور کرتے تھے۔ مشرقی تہذیب کا تحفظ بطور مقصد اکبرالہٰ آبادی کے نزدیک مشرقی تہذیب محض رسوم ورواج کا نام نہیں تھی بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات تھا جس کی بنیاد مذہب، اخلاق اور خاندانی وحدت پر استوار تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغربی تہذیب اس نظام کو توڑ رہی ہے۔جیسا کہ خواجہ محمد زکریا نے لکھا ہے:"اکبر کا طنز سطحی نہیں بلکہ مقصدی ہے۔ وہ ہر طنزیہ شعر کے پس منظر میں ایک فکری پیغام چھپائے ہوئے ہیں۔اُن کا اصل مقصد قوم کو یہ احساس دلانا تھا کہ اندھی تقلید سے تہذیب وثقافت تباہ ہو جاتی ہے اور شناخت کھو بیٹھتی ہے۔"(اکبرالہٰ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ص ۸۵)

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کو اس تہذیبی بحران کے بارے میں خبردار کیا جو مغرب کی اندھی تقلید سے پیدا ہو رہا تھا۔

اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں قومیت اور حب الوطنی ایک نہایت اہم اور نمایاں پہلو ہے۔ اگر چہ وہ براہِ راست تحریکِ آزادی میں شامل نہ ہو سکے جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ وہ سرکاری ملازمت اور بعد از اں پنشن یافتہ حیثیت میں زندگی گزار رہے تھے،لیکن اپنی شاعری کے ذریعے انہوں نے وہ کام کر دکھایا جو بعض اوقات کھلے سیاسی جلسے بھی نہیں کر پاتے۔انہوں نے اپنے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب میں ہندوستانی قوم کے احساسات، دکھ اور محرومیوں کو اس خوبی سے بیان کیا کہ اُن کے اشعار عوام کے دل کی آواز بن گئے۔اکبر کے یہاں قومیت محض سیاسی شعور تک محدود نہیں بلکہ تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کا نام ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوم کی اصل طاقت اس کی تہذیب، اخلاق اور مشرقی قدریں ہیں۔ اِس لیے ان کی حب الوطنی کا رنگ ان کی مشرقیت سے جڑا ہوا ہے۔ ذو معنی شاعری اور علامت نگاری اکبر نے اپنی حب الوطنی اور قومی شعور کو بیان کرنے کے لیے اکثر دوہری معنویت کا سہارا لیا۔اُن کی شاعری میں ایک سطحی معنی ہوتا ہے جو محض مزاح یا تفریحی انداز میں محسوس ہوتا ہے،لیکن اس کے پسِ پردہ ایک گہرا قومی اور سیاسی مفہوم چھپا ہوتا ہے۔ یہ اسلوب دراصل برطانوی دور کے سیاسی دباؤ کا نتیجہ تھا، کیونکہ کھل کر حکومت کے خلاف لکھنا ممکن نہیں تھا۔اسی لیے انہوں نے طنز اور استعاروں کے ذریعے اپنی اصل بات پہنچائی۔مثال کے طور پر:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ شعر بظاہر طنزیہ ہے،لیکن درحقیقت اس میں برطانوی حکومت کے دوہرے معیار اور ناانصافی پر بھرپور تنقید ہے۔ سیاسی وسماجی حالات کی عکاسی اکبر کی شاعری میں اپنے عہد کے بڑے بڑے سیاسی اور سماجی واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ محض رومانی یا انفرادی شاعر نہیں بلکہ اپنے زمانے کے اجتماعی حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔اُن کی شاعری میں درج ذیل واقعات اور رجحانات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مسجد کانپور کا واقعہ جلیاں والا باغ کا خونی سانحہ تحریک عدم تعاون، گئو رکھشا کی تحریک، مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات یہ تمام سیاسی وسماجی مظاہر اکبر کے طنزیہ کلام میں یا تو براہِ راست یا بالواسطہ نظر آتے ہیں۔اکبر نے عدمِ تعاون کے بارے میں خاص طنزیہ انداز میں کہا، جب انہیں حکومتی دباؤ پر اس تحریک کے خلاف اشعار لکھنے کو کہا گیا:

بھرتے ہیں میری آہ کو فوٹو گراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

یہ شعر اکبر کے اندرونی کرب کی علامت ہے۔ وہ اس دباؤ کو مزاح کے پردے میں بیان کرتے ہیں لیکن اصل میں یہ ایک قومی اور سیاسی احتجاج ہے۔
اکبر کی شاعری میں علامتوں کا استعمال بہت مؤثر ہے۔اُن کی مشہور نظم میں بسکٹ، پوری اور چپاتی کو مختلف طبقات کے نمائندہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

دھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی
بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی
ہاں بسکٹ انگریزوں کی نمائندگی کرتا ہے،
پوری ہندوؤں کی، اور چپاتی مسلمانوں کی

اس تمثیل کے ذریعے اکبر نے بڑی سادگی مگر مؤثریت کے ساتھ یہ پیغام دیا کہ ہندوستانی (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ نرم دل اور انسان دوست ہیں۔ حب الوطنی اور قومی وحدت اکبر کی قومیت ہندو مسلم اتحاد پر مبنی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوم کی بقا اور آزادی تبھی ممکن ہے جب دونوں بڑی قومیں مل کر انگریزوں کے تسلط کے خلاف کھڑی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بار بار ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی قوم اور مشرقی قدروں کی بات ملتی ہے۔ جیسا کہ افصح ظفر لکھتے ہیں:

''اکبر نے اپنی شاعری کو ایک ایسا اسلوب عطا کیا جس کے پردے میں وہ قوم کو بیدار کرتے ہیں۔ اُن کے طنز میں ایک محبِّ وطن دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے جو قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کرتا ہے۔''

(اکبر الہٰ آبادی: ایک سیاسی وسماجی مطالعہ، دہلی)

اکبر الہٰ آبادی بنیادی طور پر طنز ومزاح کے شاعر مانے جاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری محض تفریح یا دل لگی کا سامان نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فکری سرمایہ ہے۔ انہوں نے نظم نگاری کو ایک ایسا ہتھیار بنایا جس کے ذریعے وہ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورتِ حال پر بات کرتے ہیں۔ اُن کا فن ان کے عہد کے مسائل کی عکاسی کرتا ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں مسکراہٹ اور فکر دونوں پیدا کرتا ہے۔ اکبر کی نظموں میں زیادہ تر سماجی وسیاسی طنز ملتا ہے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی نظموں کے ذریعے بڑے بڑے مسائل کو آسان اور دلچسپ انداز میں بیان کیا۔ اُن کے موضوعات یہ ہیں:
مشرقی ومغربی تہذیب کا تصادم، تعلیم اور مغربی اثرات، پردہ اور عورت کی آزادی، قومیت اور حب الوطنی، طبقاتی فرق اور سماجی تضادات مثال کے طور پر، ان کی ایک مختصر مگر بامعنی نظم ہے:

کیا غم ہے جو گورے ہوئے گھوڑوں پہ سوار
ہم کو تو یہ خوشی ہے کہ ہم گدھوں پہ نہیں

یہ مختصر سا شعر ہی انگریز حکمرانوں کی طرف طنز بھی ہے اور ہندوستانی عوام کی بے بسی کی عکاسی بھی۔

طنزیہ اور مزاحیہ رنگ اکبر کی نظم نگاری کا سب سے بڑا ہنر یہ ہے کہ وہ تلخ سے تلخ حقیقت کو ہنسی کے پردے میں چھپا دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں طنز اور مزاح دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ قاری بظاہر مسکرا دیتا ہے لیکن دل ہی دل میں چونک اٹھتا ہے۔ جیسا کہ وہ مغربی تعلیم پر طنز کرتے ہیں:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ شعر بظاہر مزاحیہ ہے مگر اس میں انگریزوں کی ناانصافی اور ظلم پر کڑی تنقید چھپی ہوئی ہے۔

اکبر الہٰ آبادی کی ایک بڑی خصوصیت انگریزی الفاظ کا طنزیہ اور برمحل استعمال ہے۔ وہ انگریزی الفاظ کو اس انداز میں اُردو شاعری میں داخل کرتے ہیں کہ نہ صرف زبان کی دلکشی برقرار رہتی ہے بلکہ طنز کی کاٹ بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً:

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

اور اسی طرح:

کہا بی اے سے میں نے کل، بتا تجھ کو خبر کیا ہے
کہا اس نے کہ اے سرکار! یہ سب انگریزی حرف ہے

یہی انداز اکبر کی شاعری کو اپنے ہم عصروں سے منفرد بناتا ہے۔

اکبر کی نظموں میں درج ذیل فنی خصوصیات نمایاں ہیں:

سادگی و برجستگی ان کی زبان عام فہم اور سہل ہے۔ روزمرہ محاورات کا استعمال ان کے اشعار عوام کی بول چال سے قریب ہیں۔ تمثیل اور علامت بسکٹ، پوری، چپاتی جیسی علامتیں قاری کو فوراً اصل بات سمجھا دیتی ہیں۔ طنزیہ اشارے وہ براہِ راست حملہ نہیں کرتے بلکہ اشاروں کنایوں میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ مضمون آفرینی چھوٹے چھوٹے اشعار میں بڑی حقیقتوں کو سمو دینا ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جیسا کہ خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''اکبر کی نظموں میں زبان کی سادگی، طنز کی کاٹ اور فکر کی گہرائی ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ یہی ان کا کمال ہے کہ وہ عوامی شاعر بھی ہیں اور فکری شاعر بھی۔''

(اکبرالہٰ آبادی: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ص۳۷)

اکبرالہٰ آبادی کی شاعری اور نظم نگاری پر اُردو تنقید میں ہمیشہ خاص توجہ دی گئی ہے۔ نقادوں نے انہیں محض طنز و مزاح کا شاعر نہیں مانا بلکہ ایک سنجیدہ مفکر، تہذیبی مصلح اور قوم پرست شاعر کے طور پر بھی دیکھا ہے۔ مثلاً پروفیسر کلیم الدین احمد نے اکبر کی نظم 'برق کلیسا' کے بارے میں کہا: "اس نظم میں سادگی، صفائی اور پاکیزگی ہے۔ یہ اکبر کی بصیرت اور اُن کے فنی کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔" یہ رائے اکبر کی نظم نگاری کے جمالیاتی پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدر رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

اکبرالہٰ آبادی کی شاعری اُردو ادب میں محض طنز و مزاح نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری و تہذیبی تاریخ ہے جس میں مشرقی اقدار کا دفاع، مغربی تہذیب پر تنقید، قومی شعور اور اصلاحی پہلو یکجا ہیں۔ ناقدین کے مطابق وہ سنجیدہ مفکر اور قوم پرست شاعر تھے جو طنز کے پردے میں سماج کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے پردے، عورتوں کی آزادی، مغربی تعلیم اور اندھی تقلید جیسے مسائل پر تنقیدی نظر ڈالی اور اپنی قوم کو مشرقی جڑوں سے وابستہ رہنے کا پیغام دیا۔ اگرچہ وہ براہِ راست سیاست میں شریک نہ ہوئے لیکن شاعری کے ذریعے قومیت اور حب الوطنی کا شعور اُجاگر کیا، ہندو مسلم اتحاد اور برطانوی مظالم پر آواز بلند کی۔ اُن کا طنز و مزاح محض دل لگی نہیں بلکہ اصلاح اور بیداری کا ذریعہ ہے، جبکہ سادہ زبان، روزمرہ محاوروں اور انگریزی الفاظ کا شگفتہ استعمال اُن کے فنی امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔ یوں اکبر کی شاعری مشرقیت اور قومیت کا حسین امتزاج ہے۔

اکبرالہ آبادی بحیثیت قومی شاعر

اکبرالہ آبادی اردو ادب کے مشہور مزاح نگار تھے۔ انکی شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید اور اصلاح معاشرہ تھا۔ اکبر کا نظریہ فکر کسی خاص طبقہ یا جماعت تک محدود نہیں تھا بلکہ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا اور اُسے اپنی شاعری میں برتا۔ غزل گوئی کو چھوڑ کر ان کی تمام شاعری قومی شاعری ہے۔ ان کی قومی شاعری کے متعلق نورالرحمٰن لکھتے ہیں۔

''اکبر قومی شاعری کے میدان میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز و بلند نظر آتے ہیں۔ اکبر کے معاصرین کی قومی شاعری کسی مخصوص جماعت کے مخصوص حالات سے متعلق ہوتی تھی لیکن اکبر کا فکر کسی جماعت یا طبقہ میں محدود نہ تھا، وہ انسانیت اور کائنات کے وسیع فضا میں سانس لیتا تھا، وہ زندگی کے ہر پہلو اور انسانی تگ و دو کے ہر میدان تک رسائی رکھتا تھا، وہ انسان کے ضمیر اور اس کے مقاصد کی بلندیوں تک پہنچتا تھا۔'' (۱)

اکبر کی شاعری کا موضوع انسان اور سماج ہے۔ انہوں نے اپنی قومی شاعری میں انسان کو بغیر کسی طبقاتی یا جماعتی تفریق کے موضوع سخن بنایا ہے۔ اور اس صنف میں انھیں کمال حاصل ہے۔ پروفیسر حامد حسین قادری اکبر کی قومی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔

''نئی شاعری اور قومی نظموں میں اکبرالہ آبادی کو ایک خاص حیثیت سے ممتاز درجہ حاصل ہے یعنی علاوہ قدیم روش کی غزلوں کے اکبر نے ظریفانہ رنگ میں قومی و سیاسی مسائل بیان کئے۔ اس طرز میں کوئی شاعر ان سے بہتر کیا ان کے برابر بھی نہ لکھ سکا۔ گویا اکبر اپنے طرز جدید کے موجد و خاتم دونوں تھے۔ بندش کی چستی اور شاعرانہ اُستادی اکبر میں اس حد تک تھی کے حالؔی اور آزاؔد کا درجہ بھی کم ہے۔'' (۲)

اکبرالہ آبادی کا تعلق مشرق سے تھا اس لئے وہ مشرقی روایت کے پابند نظر آتے ہیں۔ انکا دور بھی ایسا تھا جب ملک ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ہندوستان کے باشندہ محض ان کے غلام بن کر رہ گئے تھے۔ انگریز نہ صرف ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے بلکے وہ اپنی تہذیب اور طرز زندگی کو بھی ہندوستانیوں پر مسلط کر رہے تھے، جو اکبر کو نہ قابل قبول تھی۔ ساتھ ہی ساتھ اکبر ایک مذہبی انسان تھے اس لئے انھوں نے مغربی تہذیب، مذہبی بیزاری روحانی قدروں کی شکست و ریخت کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور سائنس کی کھل کر مخالفت کی جس کے سبب ان پر ماضی پرست اور رجعت پرستی کا الزام بھی لگایا گیا۔ بقول احتشام حسیؔن:

''انھوں نے مغربی تہذیب اور سائنس کی مخالفت کر کے ہندوستان پر معاشی ترقی اور سیاسی شعور کے دروازے بھی بند کرنے کی کوشش کی''۔ (۳)

اکبرالہ آبادی کا دور قدیم و جدید خیالات و نظریات کے ٹکراؤ کا دور تھا۔ اکبر ہندوستان کی ترقی کے خلاف نہیں تھے لیکن انھیں انگیزوں کے ہر کام پر شبہ تھا کیونکہ انھیں لگتا تھا کہ انگریزوں کی تہذیب اور طرز زندگی کو اپنا کر ہندوستانی عوام جسے اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ان کی ترقی نہیں بلکہ پستی ہے جو مشرقی روایت اور ہندوستانی تہذیب کو پامال کر رہی ہے۔ انگریزوں کی اندھی تلقید سے ان کی طرز زندگی میں جدت تو آئی لیکن اس میں یورپی روح کا کہی پتا نہیں تھا۔ اکبر کہتے ہیں۔

ہر چند کہ کوٹ ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں یہ پوچھتا ہوں تم سے ہندی
یورپ کا تیری رگوں میں خون بھی ہے

ڈاکٹر اقصیٰ امان، الہ آباد

انگریزی حکومت سے قبل ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی خوبصورت مثال دیکھنے کو ملتی تھی لیکن انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کبھی کامیاب تو کبھی ناکام ہوئے، ہندو مسلمان جو بھائی بھائی تھے وہ اب زبان پر لڑ رہے ہیں تو کبھی گائے پر اکبر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ لطف اب ہندو و مسلماں میں کہاں
اغیار ان پہ گزرتے ہیں خندہ زاں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث
ہے سخت مضر یہ نسخہ گاؤ زباں

اکبر جو ایک سچے ہندوستانی تھے انھیں ایسے حالات دیکھ کر سخت ملال ہوتا ہے وہ ہندوستانی عوام کو لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ ان کی خواہش تو انھیں ایک دیکھنے کی تھی اسی لیے وہ اپنی خواہش کو اس اشعار میں ظاہر کرتے ہیں۔

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

اکبر الہ آبادی نے تعلیمی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ انگریزی تعلیم کے خلاف نہ تھے لیکن انھیں اس بات پر اعتراض تھا کہ ہندوستانی انگریزی تعلیم کی روح کو حاصل کرنے کے بجائے صرف ظاہری تعلیم حاصل کرنے میں ہی مگن ہیں وہ علم تو حاصل کر رہے ہیں لیکن یورپی قوم کی طرح ہنر نہیں سیکھ رہے ہیں و انگریزوں کی محبت حکمت اور دور اندیشی سے سبق نہیں سیکھ رہے ہیں۔ اکبر لکھتے ہیں۔

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزّت ہے نیکوں میں اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

اس کے علاوہ مغربی تعلم ہندوستانی نوجوانوں کو اخلاقی طور پر بھی متاثر کر رہی تھی ان میں اخلاقی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں اور ہندستانی نوجوان نہ اپنی انفرادیت قائم رکھ پا رہے تھے اور نہ ہی انگیزوں کی عالمانہ شان کو اپنا سکے تھے۔ اکبر کا یہ شعر کتنی وسعت رکھتا ہے۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم چھٹ گئے

اس دور میں آزادی نسواں بھی ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا جس کی اکبر نے بھرپور مخالفت کی ہے۔ چونکہ اکبر ایک مذہبی انسان تھے اس لئے انھیں عورتوں کی بے پردگی سے سخت نفرت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب کے اثرات نے عورتوں سے حیا کی چادر چھین لی ہے اور وہ اپنا ہندوستانی مذاج بھول گئی ہیں۔ مثال کے تور پر انکے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اس سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کے عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبرعورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ عورتوں کے پردہ کے دل سے قائل تھے۔ انکا خیال تھا کہ عورتیں تعلیم تو حاصل کریں لیکن باپردہ رہ کر۔ اپنے اس خیال کو اکبر نے اس شعر میں کتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اکبرکو سرسید سے اور انکی تحریک سے کچھ معاملات میں اختلاف تھا لیکن یہ اختلاف شخصی نہیں بلکہ نظریاتی تھا۔ اکبرالہ آبادی مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کو ناپسند کرتے تھے اور ان ہندوستانیوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو انگریزوں سے مرعوب آنکھیں نبد کر کے انکی نقل کر رہے تھے۔ سرسید سے انکا اختلاف بھی اسی وجہ سے تھا۔ اکبر کا خیال تھا کہ سرسید کی تحریک کا ہندوستانی نوجوانوں پر غلط اثر پڑ رہا ہے، اور وہ انگریزوں کی نقل کرنے میں ہی اپنی بہتری سمجھ رہے ہیں لیکن جب دونوں کی ملاقاتیں ہوئیں اور تبادلہ خیال ہوا تو اکبر کا سرسید کے متعلق نظریہ بھی بدل گیا اور اپنے آخری دلذں میں انھوں نے سرسید کی کارگزاریوں کو جم کر تعریف بھی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

واہ اے سید پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں یہ سوز جگر کیا کہنا
ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے اور کرنے والے میں

اکبر اور انکے معاصرین نے شعروادب کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اکبرالہ آبادی کو اصلامی شاعر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''سرسید تحریک کے علم برداروں نے اور اکبر نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعہ قومی اصلاح کی کوشش کی۔ سماجی اعتبار سے متضاد نقطہ نظر رکھنے کے باوجود سرسیّد، حالؔی اور اکبر یکساں ادبی نقطہ نظر کے حامل تھے۔''(۴)

اکبرالہ آبادی کو ذاتی طور پر سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے عملی سیاست میں حصّہ بھی نہیں لیا، لیکن انگریزی حکومت نے ہندوستانی عوام کو اتنا کچل دیا تھا کہ وہ اس سے بددل ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے ہندوستانی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور مسلم ہونے کے ناتے انھیں اس بات کا بھی غم تھا۔ اکبر کے متعلق عبدالماجد لکھتے ہیں۔

''حضرت اکبر نے شعھاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا''۔(۵)

اکبر کی تعلیم وتربیت میں ہندوستانی ماحول اور فکر موجود تھی۔ اس ملک کے لوگ سیاست میں طاقت کے استعمال پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اکبر کے شعور میں بھی ہندوستانی سیاست کی یہی رو موجود تھی۔ انھیں بھی لگتا تھا کہ طاقت کے ذریعہ انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔

اکبر کوئی سیاست داں مدبّر نہیں تھے لیکن پڑھے لکھے باشعور انسان تھے وہ ہندوستانی عظمت کے دل سے قائل تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کو ہندوستانی سیاست کی فلاح و بہبود اور آزادی کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ اکبر مشرقی سیاست اور مغربی حکومت سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ مشرقی سیاست جو طاقت کے دم پر زندہ تھی طاقت ختم ہوتے ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا جبکہ مشرقی سیاست طاقت کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے لوازمات کی بنا پر سیاسی ذہنی اور طبعی فتح بھی حاصل کرتی ہے۔ اکبر لکھتے ہیں۔

مشرق تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغرب اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس دور میں ہندوستان کے حالات اس طرح ہو گئے تھے کہ یہاں کی عوام ہندو مسلم سبھی کا کس بل نکل چکا تھا۔ مسلمانوں کے حالات ہندوؤں سے بھی بدتر ہو چکے تھے۔ ایسے حالات میں اکبر کا سیاسی شعور پروان چڑھا اور انھوں نے سیاست کے بدلتے ہوئے حالات سے اپنی قوم کو باخبر کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کے لئے انھوں نے اپنے کلام میں طنز و ظرافت سے کام لیا۔

اکبر نے انگریزی قوم کا علمی، عملی اور فکری مطالعہ کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کے یہ قوم موقع پرست اور مفاد پسند ہے اس دور حکومت میں غریبوں اور مجبوروں کا استحصال ہو رہا ہے۔ بظاہر اس دور حکومت میں بہت سی ترقی ہوئی ہے لیکن یہ ترقی ہندوستانی عوام سے زیادہ انگریزی قوم کے لیے مفید ثابت ہو رہی تھی۔ ہندوستانی عوام انگریزوں کی سیاسی پالیسی سے بے خبر تھے اور کیا سیاست داں مدبّر، پنڈت، علما سب کے سب مغربی سیاست کے جال میں پھنس کر رہ گئے۔ اکبر ایک بے دار ذہن کے مالک تھے لہاذا انھوں نے طنز و مزاح کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح کا کام لیا اور سماج میں پھیلی ہوئی سیاسی، سماجی اور اخلاقی برائیوں پر تنقید کی انھوں نے وطن پرستی اور مذہب وملت کا پیغام دیا۔

اکبر الہ آبادی کی زبان سادہ اور عام فہم ہے انھوں نے اپنی شاعری میں تشبیہ و استعارے کا بھی خوبصورت استمال کیا ہے۔ اکبر نے موقع اور محل کے اعتبار سے انگریزی الفاظ کا ایسا استعمال کیا ہے کہ ان الفاظ نے شعر کی وسعت اور معنے میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

حواشی:

(۱) اکبر الہ آبای اور ان کا کلام از نور الرحمٰن ص۔۱۱
(۲) تاریخ و تنقید ادبیات اُردو از پرروفیسر حامد حسن قادی ص۔۸۱
(۳) تنقید و عملی تنقید از پروفیسر احتشام حسین ص۔۱۴۵
(۴) انتخاب اکبر الہ آبادی از ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوئی ص۔۷
(۵) اکبر نامہ از مولانا عبد الماجد ص۔۷۲

اکبرالہ آبادی کی مکتوب نگاری

(اکبرالہ آبادی کے نو دریافت مکاتیب بنام علامہ اقبال کے حوالے سے)

اکبرالہ آبادی، الہ آباد کی اردو ادبی تاریخ میں ایک ایسی عبقری شخصیت کے طور پر گذرے ہیں جن کی حیثیت اردو زبان و ادب میں نابغۂ روزگار کی ہے۔ الہ آباد شہر کی خوش قسمتی ہے کہ ایک اہم ترین شاعر اور نثر نگار کی بدولت یہاں کی ادبی فضا اپنے پروان کو چڑھی اور دنیائے علم و ادب میں اس شہر نے اپنی روشنی پھیلائی۔ گوکہ اس سے پہلے بھی کئی شعرا گزرے تھے لیکن اس عہد میں جو شہرت اکبرالہ آبادی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اکبرالہ آبادی کی تاریخ پیدائش کے تعلق سے کوئی یقینی تاریخ نہیں بتائی جاسکتی اس لئے کہ کئی محققین نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء بتائی ہے لیکن بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبرالہ آبادی ۱۸۴۵ء کو اپنا سال ولادت قرار دیتے ہیں۔ سر عبدالقادر نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ اکبرالہ آبادی کی پیدائش الہ آباد کے قصبہ بارہ میں ہوئی تھی۔ اکبرالہ آبادی کے تعلق سے بہت سی باتیں اب بھی تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً ان کی تاریخ پیدائش، ملازمتیں، ان کے خواندگی زندگی کے مسائل اور ان کا صحیح تجزیاتی مطالعہ، خطابِ خان بہادری اور بھی ایسے کئی تحقیقی پہلو ہیں جو اختلاف میں ہیں۔ بہر حال ان تفصیلات کی تحقیق کے لئے کوئی اور مضمون لکھنے کا ارادہ ہے۔۔ اکبرالہ آبادی اپنے دورانِ ملازمت مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے مثلاً گونڈہ، بہرائچ، غازیپور، بنارس وغیرہ۔ اکبرالہ آبادی کی آخری زندگی بڑی صعوبتوں اور کرب ناکیوں میں گذری۔ ان کا انتقال ۹ ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو الہ آباد میں ہوا اور اِسی شہر کے تاریخی قبرستان کالے ڈانڈے میں مدفون ہوئے۔ اب بھی ان کی قبریں صحیح سالم موجود ہیں۔ اور ان کے پہلو میں ان کے بیٹے عشرت حسین اور اقربا ہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کے تعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی جلدوں میں ان کی شاعری کے مجموعے آ بھی چکے ہیں لیکن اب بھی بہت سارا کلام منتظر اشاعت ہے۔

اردو ادب میں مکتوب نگاری کی روایت مستحکم ہے اور متفقہ طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا مرزا رجب علی بیگ سرور (۱۷۸۶ء۔۱۸۶۹) کے رقعات سے ہوئی۔ اردو میں جو اہم مکتوب نگار گزرے ہیں ان میں واجد علی شاہ، مرزا غالب، امیر مینائی، الطاف حسین حالی، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال، مولوی عبدالحق کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن اور بھی کئی اہم نام ہیں۔ یہاں اکبرالہ آبادی کا تذکرہ لازمی ہے اس لئے کہ وہ بھی اپنے عہد کے معاصرین کو خطوط لکھتے رہے تھے۔ جن کی تعداد ۲۰۰۰ سے بھی زائد کو پہنچتی ہے۔ مکتوب نگاری ایک دلچسپ آرٹ ہے یہ انسانی خود کلامی کا ایک اہم ذریعہ تو ہے ہی خبر رسانی کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کے فروغ کا ذریعہ بھی ہے اور تاریخ و سوانح کا اہم ماٰخذ بھی۔ اس میں وعظ و نصیحت بھی اور لطافت و ظرافت بھی۔ یہ قومی اصلاح کی تحریک بھی ہے اور فطرت نگاری کا مرقع بھی۔ اس میں طنز بھی ہے اور شوخی و شگفتگی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی دنیا ہے جو اپنی تاریخ خود رقم کرتی ہے۔ مکتوبات کے ذریعہ تہذیب و تاریخ کی شناخت و پہچان کے ساتھ ساتھ اردو نثر کا ایک اسلوب بھی سامنے آتا ہے۔ جس کے ذریعہ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی حوالے سے ادب کی مختلف جہتوں کی آشنائی ہوتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ مرزا سلطان احمد کے نام خطوط کا مجموعہ ہے جو اکبرالہ آبادی کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس میں جو خطوط ہیں وہ ۲ ر دسمبر ۱۹۰۵ء سے لے کر ۲۴ ر جنوری ۱۹۲۱ء کے ہیں۔ اس کے علاوہ مکاتیب اکبر کے نام سے دو مجموعے شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ مکاتیبِ اکبر کے نام سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ یہ مکاتیب مشہور شاعر مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے نام لکھے گئے ہیں اس میں مجموعہ میں ۱۹۰۹ء سے لے کر ۲۸ ر اگست ۱۹۲۱ء کے دوران کے مکاتیب ہیں۔ اور دوسرا مجموعہ عبدالماجد دریابادی کے نام خطوط کا ہے جو ۱۹۲۳ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں پہلا خط ۱۹۱۳ء کا لکھا ہوا ہے اور آخری خط کی تاریخ ۲۲ ر جولائی ۱۹۲۱ء ہے۔ مولانا عبدالماجد سے اکبرالہ آبادی کے بڑے گہرے تعلقات تھے انھوں نے ۱۹۴۴ء میں خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع کیا جس میں شبلی نعمانی، اکبرآبادی اور محمد علی کے خطوط ہیں۔ حالانکہ اس میں اکبر کے بیشتر وہی خطوط ہیں جو اس سے پہلے عبدالماجد دریابادی کی مرتب کردہ مکاتیب اکبر میں شامل ہیں۔

زینت خاتون، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

رقعاتِ اکبر کے نام سے محمد ضمیر ہمایوں نے اکبرالہ آبادی کے خطوط کو مرتب کر کے لاہور سے شائع کیا۔اس کے سن اشاعت کے بارے میں تو معلوم تو نہیں ہو سکا لیکن شیخ عبدالقادر نے جو ابتدائیہ لکھا ہے اس میں ۱۹۲۹ء درج ہے۔اس سے ظاہر کہ یہ اسی سال چھپا ہوگا اس مجموعے میں اکبرالہ آبادی نے جن لوگوں کے نام خطوط لکھے ہیں ان میں سید سلیمان ندوی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، سید افتخار حسین، مہاراجہ کشن پرشاد، منشی سرف الدین اور سر شیخ عبدالقادر بطور خاص ہیں۔خواجہ حسن نظامی نے بھی اکبر کے دو مجموعے ترتیب دیے ہیں۔جس میں تقریباً ۲۵۰ سے زائد خطوط شامل ہیں۔خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۵۱ء میں اکبر الہ آبادی کے خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع کیا جس میں صرف اکبر حسین اور مہاراجہ کشن پرشاد کی خط و کتاب شامل ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے سر تیج بہادر سپرو، موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ جیسی شخصیتوں سے بھی ان کی مراسلت تھی۔ یہاں میں اکبرالہ آبادی کے ان خطوط کے حوالے سے گفتگو کرنا مقصود ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً علامہ اقبال کو لکھے تھے۔تحقیق کے مطابق اکبرالہ آبادی نے علامہ اقبال کو پہلا خط ۲۳ جنوری ۱۹۱۰ء کو لکھا تھا۔اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا اور انھوں نے دیڑھ سو کے قریب خط لکھے ہوں گے۔علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی کو کتنا مقام دیتے تھے ان کی تصدیق کے کئے علامہ اقبال کے خطوط سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مُریدا اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت اور عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔''

(مکتوب مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

''آپ کے خطوط جو میرے پاس سب محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں۔کئی دفعہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجیے مگر میں خود خط لمبا لکھنے سے گھبراتا ہوں پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا لکھنے کی زحمت دوں۔ یہ ایک طرح کی روحانی خودغرضی ہوگی جس کا ارتکاب میرے نزدیک گناہ ہے۔''(۹ر نومبر ۱۹۱۱ء)

''آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔حضرت، میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔''

(۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ء)

''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔اس واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔''

(۱۸ر اکتوبر ۱۹۱۵ء)

''الحمدللہ کہ جناب کا مزاج بخیر ہے۔واقعی آپ نے سچ فرمایا کہ ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہِ شفقت ایک طرف۔اس واسطے تو جب کبھی ملتا ہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور پہاڑ پر جانے کی بجائے ان کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔''

(۱۳ر اگست ۱۹۱۸ء)

آپ کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں وہ نہایت پُر معنی اور مفید ہوتے ہیں، ان کو جمع کر لینا چاہیے تا کہ آئندہ نسلیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ قلم اور دوات لے کر ہر وقت آپ کے پاس بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں اسے نوٹ کر لے۔اگر میں الٰہ آباد میں قیام کر سکتا تو آپ کے لیے وہ کام کرتا جیسا باسویل (Boswell) نے ڈاکٹر جانسن (Dr. Johnson) کے لیے کیا تھا۔''

(بحوالہ 'حیاتِ اکبر' ص ۱۲۹)

علامہ اقبال کے خطوط سے ان کی اکبرالہ آبادی کے تئیں کس قدر احترام و عقیدت ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اکبرالہ آبادی کے اثرات علامہ اقبال کی ذہنی

فطریات ومحسوسات پر مترسم نظر آتے ہیں۔علامہ اقبال انھیں پیرومرشد جیسا مقام دیتے تھے۔حالانکہ دونوں ایک ہی عہد کے نمائندہ شعرا تھےلیکن دونوں نے اپنے خطوط میں نثر نگاری کے وہ وہ جوہر دکھائے ہیں جن کی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے۔ان دونوں شخصیتوں میں گہرے روابط اور قریبی تعلقات کے ساتھ ساتھ بے تحاشہ ذہنی قربت تھی۔علامہ اقبال اکبرالہ آبادی کے نظریوں سے حد درجہ متاثر تھےجن کا اظہار اکبرالہ آبادی اپنے اشعار میں کیا کرتے تھے۔علامہ اقبال کوان کی شاعری میں ایک ایسی شخصیت اپنے جملہ پہلوؤں کے ساتھ جھلکتی نظر آتی تھی جس میں ادب،فلسفہ،مذہب اور سیاست کی دنیا میں اہم نقوش ثبت کئے ہیں۔اکبرالہ آبادی کےخطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی علامہ اقبال کواپنے عہد کا ایسا شاعر تسلیم کرتے تھے جوامتِ مسلمہ کے لئے نادرِروزگار کی حیثیت رکھتا ہے۔اکبرالہ آبادی مذہب کی معلومات کی بنیاد پر وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ علامہ اقبال اپنے صحیح اسلامی شعار کے مطابق ہی اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھیں۔ایک موقع ایسا بھی آیا تھاجب علامہ اقبال نے اپنی مثنوی اسرارخودی میں حفیظ شیرازی اورصوفیانہ تصورات پرتنقید کی تھی جس پرا کبرالہ آبادی نے انھیں نہایت انکساری اور منکسرالمزاجی کے متعلق ان کوسمجھانے کی کوشش کی جس پرعلامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کی محبت اوراحترام میں ان کے مشورے کوقبول کرتے ہوئے اسرارخودی کے آئندہ ایڈیشن میں ان اشعارکوحذف کر دیا۔اکبرالہ آبادی علامہ اقبال کی دینی عقیدت اوران کےفلسفیانہ اقدار کی تشکیل وتعمیر کے ہمیشہ متلاشی رہے تھے۔یہی سبب ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں آخری دم تک ایک دوسرے کےصرف ہمنوا ہی نہیں رہے بلکہ ذہنی ہم آہنگی کو قائم رکھا۔۹رنومبر ۱۹۱۴ءکوجب علامہ اقبال کی والدۂ محترمہ رحلت ہوئی تھی تو علامہ اقبال کی گذارش پر ہی اکبرالہ آبادی نے قطعہءتاریخ فارسی زبان میں لکھا تھا جسےعلامہ اقبال نے اپنی والدہ کے مقبرے پرکتبہ نصب کرایا۔

مادرۂ مخدومۂ اقبال رفت
رفت سوئے جنت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر بادلِ پُردرد و غم
''رحلتِ مخدومہ'' تاریخِ وفات
(۱۳۳۳ھ)

اس کےعلاوہ اکبر نے ایک اورتاریخِ وفات اردو میں لکھی جس کے آخری دوشعر یوں ہیں۔

اکبر اس غم میں شریک حضرتِ اقبال ہے
سال رحلت کا بیاں منظور اسے فی الحال ہے
واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
''رحلتِ مخدومہ'' سے پیدا ہے تاریخِ وفات

یہاں بھی ''رحلتِ مخدومہ'' سے وہی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

علامہ اقبال نے یوں تو اکبرالہ آبادی کے نام صرف ۱۶رخطوط(بحوالہ اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاءاللہ)ہی لکھے تھے(ممکن ہےاورکئی خطوط ابھی پردہءخفا میں ہوں اوران کی تحقیق لازمی ہے)لیکن ان خطوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اکبرالہ آبادی کواپنا پیرومرشد ہی نہیں بلکہ اپنا روحانی رہنما بھی جانتے تھے۔کئی خطوط میں انھوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے۔اکبرالہ آبادی بھی چاہتے تھے کہ علامہ اقبال الہ آباد تشریف لائیں۔اورایک تحقیق کے مطابق علامہ اقبال اکبر کی زندگی میں تین مرتبہ الہ آباد بغرضِ ملاقات تشریف لا چکے تھے۔

اکبرالہ آبادی اسلامی شریعت پرسختی سے عمل کرتے تھےاورصوم وصلوٰۃ کےسخت پابند تھے۔تہجد اور تلاوتِ قرآن پاک ان کی روزانہ کی زندگی کا عمل تھا انھوں نے اکثر اپنے خطوط میں قرآنی آیات،اردوفارسی کےاشعار بھی لکھتے رہے ہیں۔

اکبرالہ آبادی کوانگریزی سےنہیں بلکہ انگریزیت سےنفرت تھی۔ان کا اپنا نظریہ تھا کہ انگریزی تہذیب وتمدن میں ہندوستانی معاشرے پرجواثرات

مرتب ہیں وہ بالخصوص مسلمان کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں اور مسلمانوں کی اپنی تہذیب اقدار، اپنے اسلامی شعار اور اپنی اسلامی شناخت گم ہوسکتی ہے۔ا تا کہ اسلام کی روحانی اور اخلاقی اقدار امت مسلمہ کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی خوش سلیقگی اور پائیداری کہیں ان مغرب والوں کے ہاتھوں مجروح نہ ہو جائے۔ اکبرالہ آبادی کے ان جملوں کو دیکھئے۔

''عجب وقت ہے عجیب مصیبت ہے، نہ دین درست نہ دنیا۔سوشل حالت کی ابتری، الامان۔کم عمر لوگ تو ہر طرح لذّاتِ نفسانی اور تعلقات دنیاوی کو دلچسپ پاتے ہیں لیکن ہم ایسوں پر مصیبت ہے۔اللہ تعالیٰ اپنا فضل کرے۔آپ کسی شغل میں ہیں۔آپ کی دانش مندی، غیرت، حق پرستی، خیر خواہی میں کسی کو کلام ہے البتہ پیرایۂ خیالات میں کچھ سختی ہوئی۔ میں نے معلوم نہیں کس ترنگ میں ایک شعر کہا تھا:

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

آپ کے مقدس احتساب کے معزز ہونے میں کیا شبہ لیکن ان دنوں کی حالت دیکھیے۔کیا وہ زندوں میں ہیں۔

(خط ۱۶ اپریل ۱۹۱۶ ص ۶۳۳)

اکبرالہ آبادی نے اپنے مکتوبات میں تفصیلی وضاحت کے ساتھ نہ صرف ادب کی اہمیت وقدر و قیمت اور خصوصیت کا بھی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے زیادہ تر امت مسلمہ کی تعلیمی پسماندگی، مالی بحران، اور مذہب سے دوری کے اسباب کی بنیاد پر اپنی قوم پر اظہار تعصب بھی کیا ہے۔وہ مسلکی جھگڑوں اور شرعی تنازعات کو ہمیشہ دین اسلام کے زہرِ ہلاہل بتایا۔انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ

''خدا قوم میں اخوت اسلامیہ پیدا کردے۔قوم کیوں بے بصیرت ہوگئی ہے اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیر ہلاکت کی کیوں موید ہے۔مجھ کو افسوس تھا اور ہے کہ باثر اور لائق مسلمان دعا کیوں نہیں کرتے یا اس میں اثر کیوں نہیں ہوتا۔''

(۲۷ اکتوبر ۱۹۱۱ء ص ۴۴۱)

اکبرالہ آبادی اپنے خطوط میں اپنے خانگی مسئلوں، زمانے کی ناقدری، بڑھاپے کا رونا اور سوسائٹی میں افراتفری کی کیفیات کو ہمیشہ بڑے ہی پُر درد انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے کہ شعر گوئی میں دل نہیں لگتا۔انہوں نے اپنی طبیعت کی سادگی، قناعت پسندی اور دردِ دل کو بیان کرنے کے لئے شاعری میں طنزیہ وظریفانہ انداز ضرور اختیار کیا لیکن اس کا بھی اعتراف کیا کہ

''شعر گوئی میں دل نہیں لگتا میرے ظریفانہ اشاعت سے کبھی بہت زندہ دلی اور شوخی کا قیاس ہوسکتا ہے لیکن عادتاً وہ بھی ایک اسلوبِ ادائے خیال ہے ورنہ بے حد افسردہ رہتا ہوں اور نہ بھی افسردہ ہوں تو ایک حیرت سی رہتی ہے اب اعتراض کس پر کروں وہ زمانہ گذر گیا۔''

ان کے مزاج کی اہم مثال یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ علامہ اقبال کو بڑے نپے تلے انداز میں مشورے بھی دیا کرتے تھے۔اور انشاء پردازی سے لے کر لطیف جذبات کی عکاسی بھی بڑے ماہرانہ لہجہ میں کرتے تھے۔تا کہ مخاطب کی شان میں کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے یا بدزبانی کا شک پیدا نہ ہو حالانکہ اکبرالہ آبادی عمر کے آخری حصہ میں کئی امراض کے شکار ہو گئے تھے اس لئے طبیعت میں بیزاری اور بیچارگی کا پیدا ہونا لازمی تھا۔کئی ایک سانحات نے بھی ان کی زندگی کو آزردہ کر دیا تھا۔اور اس کا برملا اظہار وہ علامہ اقبال کو لکھے گئے خطوط میں کرتے تھے۔لیکن اقبال کی حوصلہ افزائی پر وہ عموماً اپنے خطوط میں اظہار کیا کرتے تھے ایک خط میں انھوں نے لکھا۔

''میں مدت سے انواعِ شکایات میں مبتلا ہوں، دل افسردہ ہے، طبیعت مشتاقِ آخرت ہے، آپ سے زیادہ کسی نے مردانگی کے ساتھ میرے جذبات کی داد نہ دی تھی آپ کے ساتھ محبت ہوگئی۔''

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی مشورہ دیا کرتے تھے کہ

”آپ کی قوی طبیعت مغربی فلسفے اور مشرقی علوم کے ساتھ نچلی نہیں رہ سکتی میں تو اب یہی کہوں گا کہ شفقت کا پہلو لئے رہیے۔ دنیا بہت دیکھی جا چکی ہے اس پر بہت بحث ہو چکی۔“ (ص ۶۳۱)

علامہ اقبال سے تصوف کے تعلق سے ان کی بحث بڑے نپے تلے انداز میں ہوتی تھی۔ چونکہ اکبرالہ آبادی کو مذہب سے گہرا لگاؤ تھا اسی سبب وہ اقبال کو ناراض بھی کرنا نہیں چاہتے تھے اور ان کی دل جوئی اپنی طبیعت کی انکساری اور متانت سے بڑے خوش اسلوبی کے ساتھ کرتے تھے۔ تصوف کے حوالے سے دونوں ذہنوں میں کافی تضاد تھا لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ اپنے استدلالی رویوں اور ٹھوس عقیدے کی بنیاد پر اپنا نقطۂ نظر صاف صاف بیان کرنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہاں چند ایک مثالوں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

> مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ! حسن نظامی صاحب سے میرا تعلق بہ وجہ تصوف اور پیری مریدی کے نہیں ہے بلکہ دیگر امور پر مبنی ہے اور وہ امور اتفاق ہیں۔ میرا تصوف وہی ہے کہ تصوف برائے شعر گوئی خوب است۔ اب آخر عمر میں یہ مذاق کیونکر جا سکتا ہے۔ زمانہ بدل رہا ہے سوشل، پولیٹیکل، مارل ہر قسم کے انقلاب ہوئے اور ہو رہے ہیں لیکن جس کا جو مذاق ہو چکا ہے یا جس کا رزق کسی خاص طریقے میں ملتا ہے وہ لوگ ضد یا ضرورت یا عادت سے مجبور ہیں۔ لیکن دنیا سے جلد گزر جائیں گے یا اس قدر دب جائیں گے کہ محسوس بھی نہ ہوں گے۔ (۲۶ فروری ۱۹۱۶ء ص ۶۳۲)
>
> میرا تصوف شعر گوئی کے لیے تھا اور زندگی کے ساتھ رہے گا۔ مذاقِ طبیعت مختلف ہے۔ عملی پہلو سے میں واقف نہیں۔ غزالی کہتے ہیں کرنے کی بات ہے۔ مجھ کو نہ طاقت نہ ضرورت: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا استقامت میں سب کچھ ہے، جس کو خدا نصیب کرے۔ یہی لیل و نہار ہیں تو مولوی و صوفی بتدریج سب رخصت۔ اب بھی اکثر برائے نام ہیں۔ کوشش اور طلب رزق میں سب مصروف ہیں۔ (۷ مئی ۱۹۱۷ء ص ۶۴۴)

ارباب طریقت کہاں ہیں، نادان، غریب، جاہل، فقیر بنے ہیں، پیٹ پالتے ہیں، سوسائٹی میں ہیں۔ آپ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ پولٹیکل رنگ میں جدا نہیں ہیں۔ شفقت کے ساتھ عام طور پر سمجھانا چاہیے۔ اشخاص خاص جو ذہن میں ہوں ان سے ناخوش یا malice اگر طبیعت میں ہو بھی تو صبر لازم ہے۔ (تاریخ ندارد، ص ۶۵۰)

> یہ بات صاف ظاہر ہونا چاہئے کہ آپ کو طریقت یعنی خلوصِ عمل اور محبت باری اور شوقِ لقائے باری سے اور تزکیۂ نفس سے انکار نہیں ہے۔ بلکہ مبتدعون اور محض طالبانِ دنیا اور بے علموں کی روش سے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آپ کا ذہنِ عالی اس درجے سے بالاتر ہے کہ اس گروہ سے آویزش میں دست و گریاں رہے۔ فَذَکِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرْ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرْ۔ علاوہ بریں امت پر شفقت چاہیے۔ وَلَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ ضرور ہے۔ خدا آپ کے ہیجان قلب میں سکون پیدا کرے۔
>
> (۳۲ مئی ۱۹۱۸ء ص ۶۵۹)

وہ اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی سے بھی بحث و تمحیص کر لیا کرتے تھے علامہ اقبال کے ایک مضمون کے حوالے سے انھوں نے لکھا تھا کہ توحید وحدت وجود کے متعلق آپ کا مضمون اسلامی منطق سے بخوبی مصلح تھا میں نے خواجہ صاحب کو لکھا کہ وحدت وجود کا جو کچھ خیال ہو لیکن اسلامی شریعت کے دائرہ میں رہ کر اس پر قلم نہ اٹھائیں انھوں نے مان لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسن نظامی بھی علامہ اقبال کے عاشق اور مداح تھے اور ان کے رنگ سخن نے اقبال کر گرویدہ بنا دیا تھا۔

اکبرالہ آبادی کی اس حقیقت پسندانہ طرزِ اظہار ان کی مکتوب نگاری میں جا بجا نمایاں ہے۔ کیونکہ اکبرالہ آبادی سنجیدہ اور بہترین انسانی خوبیوں کے مالک تھے ان کے معمولاتِ زندگی کا انحصار نہایت ہی سادہ اور خدا پرستی پر تھا۔ ان کی سادگی اور انسان دوستی ان کی ذات کا خاصہ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ہم عصروں میں قابل احترام سمجھے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی خیالات و افکار جن کی عکاسی علامہ اقبال کے خطوط کے علاوہ اور دوسرے معاصرین بالخصوص خواجہ حسن

نظامی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور دیگر اکابرین سے مراسلت کے توسط سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن علامہ اقبال سے ان کی مراسلت کا طریقۂ کار کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے وہ ان سے ہمیشہ دانشورانہ حیثیت سے مخاطب رہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علامہ اقبال علم و فضل کے اعتبار سے کئی شعبوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ انھیں اس کا بخوبی علم تھا کہ علامہ اقبال نے فلسفہ کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم کے توسط سے دوسرے علوم کا بھی بھرپور مطالعہ کر رکھا ہے اور ان کی طبیعت میں علم ہی علم ہے۔ اکبرالہ آبادی اپنی شخصیت کے اعتبار سے منکسرالمزاج تھے ان کے مکاتیب اقبال میں ایک خاص لطف دیتا ہے اقبال کے نام مکاتیب میں وہ ایک باوقار اور مطیع شخص کے ساتھ ساتھ ایک خالص مذہبی شخص کے طور پر متعارف ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے تنہائی سے عاجز آ کر یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ''خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں الہ آباد میں ایک شخص بھی نہیں جو ہم خیال و ہم نفس ہو۔''

اکبرالہ آبادی شاعری میں اپنی ایک الگ پہچان اور فکر تو رکھتے ہی ہیں اور انھیں بحیثیت طنز و مزاح کی حیثیت سے پیش کر کے اردو شاعری کے ساتھ ناانصافی جو کی گئی ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو انہیں ممتاز کرتی ہیں اور جن سے ان کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہی خوبی ان کی نثری تحریروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے وہ صرف عام آدمی کی مسئلوں کے شاکی نہیں تھے بلکہ امت مسلمہ کی پوری تہذیب و تمدن کے بحرانی کیفیات سے فکرمند تھے اور وہ ہمیشہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے تنقید کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ اکبرالہ آبادی کے مزاج میں یہ قطعی نہیں تھا کہ اردو میں خطوط لکھتے وقت وہ انگریزی لفظوں کا استعمال نہ کریں وہ انگریزی کو بھی اردو املا میں لکھتے تھے۔

اکبرالہ آبادی کی شخصیت کے بہت سارے پہلو علامہ اقبال کے نام خطوط سے روشنی میں آتے ہیں۔ بصورت دیگر وہ پردۂ خفا میں ہی رہ جاتے اس اختلافات کے ساتھ اتفاقات کی مثالیں بھی تفصیل سامنے آتی ہے حالانکہ یہ الگ موضوع ہے کیونکہ خواجہ حسن نظامی کے نام انھوں نے سب سے زیادہ خطوط لکھے تھے جن کی تعداد ۲۵۸ کے قریب ہے اس طرح مذہبی بحث و تمحیص میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام بھی ان کے تقریباً ۲۰۰ خطوط ہیں۔ لیکن علامہ اقبال کے نام خطوط میں جن مباحث اور ملی مسائل کے تعلق بے تکلفانہ اظہار ملتا ہے وہ ان دو حضرات کے یہاں کم کم ہے۔

اکبرالہ آبادی مباحثوں کے قائل رہے لیکن طوالت سے انحراف کرتے تھے وہ اپنے مختصر سیدھے سادے صاف اور واضح اور بناوٹ سے پاک جملوں کا استعمال کرتے رہے۔ ان کے مکتوبات کے نثر میں الفاظ و معانی متوازن نظر آتے ہیں ان کی جملوں میں ادبی حسن کے ساتھ ساتھ سادگی اور سلاست موجود رہتی ہے۔ جملے بے کیف یا مبہم نہیں ہوتے ان میں ادبیت کا رنگ بھی غالب رہتا ہے ان کی بے ساختگی اور بے تکلفی ان کی نثر کی انفرادیت ہے یہی وجہ ہے کہ طرز تحریر سنجیدہ اور متین ہونے کے باعث اپنے مافی الضمیر کو بڑے احسن طریقے سے بیان کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اقبال پر تعریض کا لہجہ بھی ملتا ہے لیکن اس میں بھی متانت قائم رہتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تجربہ علمی کے اس مقام پر تھے اور جہاں اپنے مخاطب کے لئے حفظ مراتب کے مطابق گفتگو کا لہجہ اختیار کرتے تھے۔ چونکہ اقبال کی بے پناہ صلاحیتوں ان کی علمی ادبی کارگزاریوں سے پوری طرح واقف تھے یہی وجہ ہے کہ اقبال کے تصورات و فکریات ان کے ذہن پر پوری طرح مرتسم تھے اور اقبال کو اپنا ہم آواز ہم خیال سمجھتے تھے اسی وجہ سے ان کو خطوط لکھتے وقت اپنے موضوعات میں مذہبیات، معاشرت اور سیاسیات کو بھی حصہ بنواتے تھے۔

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کے مکتوبات کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو ملنی چاہئے تھی اور ان مکاتیب کی مدد سے ان کے شخصیت شاعری اور فکری رویوں کو سمجھنے کی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ انہیں بطور شاعر تو خوب خوب مقبولیت ملی لیکن ان کو ایک فریم میں ہی رکھ کر دیکھا گیا وہ فریم تھا طنز و مزاح کا، ظرافت کا۔ یہ الگ بات کہ ان کی شاعری میں طنز و ظرافت کے عناصر زیادہ ہیں لیکن ان میں بھی سنجیدگی اور پیچیدہ زندگی کے مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اگر طنز و ظرافت کو الگ کر کے ان کی شاعری کے ایک حصہ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ساری چیزیں سامنے آ سکتی ہیں جو ان کے خطوط میں نمایاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مکاتیب کی حیثیت ثانوی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے مکتوبات کے مطالعے اور اب کے تجزیاتی مطالعے کے بغیر ان کی شاعری اور ان کی فکریات و تصورات کا مطالعہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ میں نے یہاں صرف علامہ اقبال سے ان کے ان کی مراسلت کے حوالے سے گفتگو کی ہے اور یہ وہ سارے خطوط ہیں جو اب تک منظر عام پر نہیں آئے تھے لیکن اسی سال شائع شدہ ''مجموعۂ مکاتیبِ اکبر'' (جمع و تدوین: محمد راشد شیخ) میں یہ سارے نو دریافت

خطوط پڑھنے کو ملے جو علامہ اقبال کے نام تھے جن کی تعداد تقریباً ۱۴۰ بتائی جاتی ہے۔ یہ اردو کے قارئین کے لئے پہلا موقع ہے کہ ان مکاتیب سے اکبرالہ آبادی کے وہ گوشے سامنے آئے جن کے توسط سے ہم علامہ اقبال سے ان کے مراسم، اقبال کی الہ آباد آمد، مختلف علمی وادبی مسائل، سیاسی انکشاف، خانگی زندگی کے حالات اور دیگر امور سے واقفیت ہوئی۔

اکبرالہ آبادی مشرقی روایات کے امانت دار تھے اور ان روایات کو مستحکم کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں نظر آتے رہے لیکن کبھی کبھی مغربی یلغار کے آگے یہ کمزور پڑتی نظر آتی تو ہے لیکن ذہنی استقامت اان کے پایۂ استقلال کو متزلزل ہونے سے بچائے رکھتی۔ اکبرالہ آبادی کے مکاتیب ان کی فکری، ذہنی اور قلبی کیفیات واردات اور وقوعات کے آئینہ دار ہیں اکبر ہمیشہ اس ذہنی کرب ودرد میں مبتلا رہے کہ سلطنت کے خاتمے کے بعد انگریزوں کے ہاتھوں پسپائی نے ملت اسلامیہ کو جو تکلیف پہنچائی ہے اس کے تدارک کا راستہ اب دھندلکوں میں گم ہے اور پوری قوم اخلاقی اور روحانی طور پر ذلت وخوار کے گمنامی میں ڈوبتی جارہی ہے ۔یہ داخلی کرب ودرد، یہ ذہنی انتشار، یہ افراط وتفریط تو ان کی شاعری کا مرکز ومحور ہے ہی جسے ایک سچے اور پاک طینت مسلمان کے طور پر پیش کیا لیکن اپنے مکاتیب میں بھی وہ صاحب نظر عالم، ایک دور اندیش مفکر اور ذی فہم دانشور کے طور پر نظر آتے ہیں اور ان مسائل سے روگردانی بھی نہیں کرتے۔ ان کے جتنے مکاتیب ہیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دردمند مصلح، اور یک مستقبل شناس مدبر اور ایک بے چین مضطرب مسلمان کی روح میں دکھائی پڑتے ہیں بطور خاص علامہ اقبال کے نام ان کے خطوط میں ساری باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں کیونکہ جس قدر علامہ اقبال کو اپنی امت مسلمہ سے عقیدت ومحبت تھی اسی قدر اکبرالہ آبادی کو بھی اس قوم سے قربت اور شیفتگی تھی اور اس قوم کی خاطر وہ بہت کچھ کر گزرنے کو تیار بھی تھے۔ علامہ اقبال سے اسی ذہنی یگانگت اور یکسوئی نے ان کو علامہ اقبال سے اتنا قریب کر دیا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے لئے ایک جان دو قالب ہوں۔ اکبرالہ آبادی کے انتقال پر جو خط علامہ اقبال نے لکھا تھا اس سے اندازہ ہوگا کہ ایک عہد کے لوگ کس قدر ذہنی ہم آہنگی کے ساتھ تخلیقی عمل میں سرگرداں رہے تھے۔

> ''میری بدنصیبی ہے کہ میں ان کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت تقریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔ اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کی ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے، زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور بدقسمت قوم کے لیے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔ خدا اپنے حبیب ﷺ کے صدقے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میں نے ابھی ایک تار بھی آپ کو دیا ہے اور اس کا مضمون یہ تھا:
>
> Heartiest Sympathy. India loses a Great Personality.
>
> مخلص، اقبال

اکبرالہ آبادی کے خطوط: شگفتہ مزاح میں سنجیدہ پیغام

خطوط نگاری اردو نثر کی ان اصناف میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے نہ صرف ادبی جمالیات کو فروغ دیا بلکہ انسانی سماج کی فکری و تہذیبی تاریخ کو بھی محفوظ رکھا۔قدیم زمانے سے ہی انسان اپنے جذبات، خیالات اور ضروری پیغامات کی ترسیل کے لیے خطوط کا سہارا لیتا رہا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کے مختلف مراحل میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔خطوط انسانی جذبات، خیالات اور تجربات کے وہ آئینہ دار ہیں جو وقت کے پردے میں محفوظ ہو کر آنے والی نسلوں کے لیے قیمتی ورثہ بن جاتے ہیں۔ یہ محض تحریری پیغامات نہیں، بلکہ ہر لفظ میں ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ایک دور کی زبان، تہذیب، رویے اور طرز احساس کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔خطوط نہ صرف انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں بلکہ اس دور کی اجتماعی ذہنیت اور فکری فضا کو بھی عیاں کرتے ہیں۔ان میں ادبی لطافت، سادگی، برجستگی اور حسن تخیل کی جھلک پائی جاتی ہے، جو انہیں محض مراسلت نہیں بلکہ ایک باوقار ادبی صنف کا درجہ عطا کرتی ہے۔آج کے سائنسی و ڈیجیٹل دور میں بھی خطوط کی اہمیت برقرار ہے، کیونکہ یہ انسان کی شخصیت، اس کی داخلی کیفیات اور خارجی حالات و واقعات کا نہایت گہرا اور سچا عکس پیش کرتے ہیں۔

موجودہ عہد کو بجا طور پر سائنس و ٹیکنالوجی کی بے مثال ترقی کا دور کہا جاتا ہے، جہاں انسان جدید وسائل کے ذریعے ہر میدان میں پیش قدمی کر رہا ہے۔ترسیل افکار و خیالات کے لیے واٹس ایپ، فیس بک، ٹوئٹر اور دیگر سوشل میڈیا ذرائع نے روایتی خطوط نویسی کو تقریباً پسِ پشت ڈال دیا ہے۔اب خیالات کے اظہار میں رفتار تو بڑھ گئی ہے، لیکن وہ گہرائی، وقار اور جذبات کی شدّت جو خطوط میں تھی کہیں کھو گئی ہے۔

خطوط صرف روزمرہ بات چیت یا احوال پرستی تک محدود نہیں رہتے تھے، بلکہ بڑے ادیبوں نے اس صنف کو ادبی درجہ عطا کیا۔مرزا غالب کے خطوط میں جو شگفتگی، ساختگی اور زبان و بیان کی چاشنی ملتی ہے، وہ اردو ادب میں نثر کے کمالات کی ایک روشن مثال ہے۔مولانا آزاد کے ''غبارِ خاطر'' کے مکتوبات فکری بلندی، فلسفیانہ گہرائی اور ادبی شان کے حامل ہیں۔اگر چہ اردو کے ہر مکتوب نگار نے اپنی ادبی خصوصیات کے سبب ایک جداگانہ مقام حاصل کیا، لیکن اکبرالہ آبادی کے خطوط اپنے اسلوب کی دلکشی، فکر کی گہرائی اور مزاحیہ پیرایۂ اظہار میں سنجیدگی کے امتزاج کے باعث تاریخِ مکتوب نگاری میں ایک مثالی اور ممتاز مقام کے حامل ہیں۔

اکبرالہ آبادی نہ صرف اردو شاعری کے مینارِ نور ہیں بلکہ نثر کے میدان میں بھی ان کی خدمات تاریخِ ادب کا ایک روشن باب ہیں۔ان کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنے فن سے ادب کو ایک نئی جہت عطا کی۔شاعر کی حیثیت سے ان کے کلام میں طنز و مزاح، حکمت و بصیرت اور فکری گہرائی کا حسین امتزاج ملتا ہے، اور یہی خوبی ان کی نثر میں بھی نظر آتی ہے۔اکبرالہ آبادی نے اردو کے کئی معیاری تراجم پیش کیے، جن میں ان کی زبان کی روانی، محاورات کی چاشنی اور بیان کی سلاست قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔تاہم، ان کے ادبی مقام کو حقیقی عروج ان کے خطوط نے بخشا۔یہ خطوط محض خیالات کی ترسیل نہیں بلکہ ایک ادبی ورثہ ہیں، جن میں شگفتہ مزاح کے ساتھ سنجیدہ افکار کی آمیزش قاری کو مسکرانے پر بھی مجبور کرتی ہے اور سوچنے پر بھی ابھارتی ہے۔

اکبرالہ آبادی کے مکتوب کا زمانی دائرہ تقریباً انیسویں صدی کے آخری عشرے سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے اوائل عشروں تک محیط ہے۔اکبرالہ آبادی کے خطوط کے مجموعیں 'مکاتیبِ اکبرؔ' کے نام سے دو مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'مکاتیبِ اکبرؔ' کے نام سے ۱۹۲۲ء میں دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے شائع کیا۔ یہ مکاتیب لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے نام لکھے گئے ہیں۔ 'مکاتیبِ اکبرؔ' کے نام سے دوسرا مجموعہ 'مکاتیبِ اکبرؔ حصہ دوم' عبدالماجد دریا آبادی نے ۱۹۲۳ء میں اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی سے شائع کیا ہے۔ 'رقعاتِ اکبرؔ' محمد نصیر ہمایوں نے مرتب کر کے قومی کتب خانہ لاہور سے شائع کیا۔

اکبرالہ آبادی کے خطوط نہ صرف ادبی لطافت سے مزین ہیں بلکہ اپنے اندر اس عہد کی مکمل تہذیب و معاشرتی تصویر بھی سموئے ہوئے ہیں۔ان مکتوبات میں ہمیں اس وقت کے سیاسی حالات، سماجی رویے، تعلیمی ماحول اور عوامی شعور کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔طرزِ معاشرت اور رہن سہن کی باریکیاں، لباس و خوراک کی ترجیحات حتیٰ کہ بول چال اور زبان کے محاوراتی رنگ بھی ان خطوط کے ذریعے آشکار ہوتے ہیں۔

نازیہ افضل، ریسرچ اسکالر، کالج۔حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پرایاگ راج

طرزِ گفتگو میں سادگی اور برجستگی کے ساتھ مزاح کا ایسا دلنشین رنگ شامل ہے، جو قاری کو محظوظ بھی کرتا ہے،مگر اس ہلکی پھلکی گفتگو کے پس منظر میں گہری فکری معنویت بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

''اکبرالہ آبادی کے خطوط صرف خطوط ہی نہیں بلکہ وقت کا آئینہ ہیں۔ان میں عالمانہ بصیرت اور فکری تونگری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔یہ خط حال سے ماضی تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں۔ان میں علما کا ذکر بھی شہر وقصبات کی تہذیبی تمدنی زندگی کا عکس بھی موجود ہے۔بذلہ سنجی اور قوت بیانیہ کی مثالیں ملتی ہیں۔اسلوب سادہ اور انداز بیانیہ ہے۔دوٹوک بات کرنے کا طرز اسلوب کوتازہ وشگفتہ رکھتا ہے۔تاریخی اور معاشرتی حقائق نے ان نظریاتی رویےّ کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔''

(اردو مکتوب نگاری، شاداب تبسم، ص ۳۳۹)

اکبرالہ آبادی کے خطوط میں مزاح محض تفریح یا دل لگی کے لیے نہیں بلکہ ایک فکری ہتھیار کے طور پر استعمال ہوا ہے۔وہ مزاح کے پردے میں معاشرتی خرابیوں، اخلاقی کمزوریوں اور سماجی تضادات کو اجاگر کرتے ہیں۔ان کا مزاح کبھی سطحی نہ ہوتا بلکہ اس کے پیچھے ایک سنجیدہ مقصد کارفرما رہتا ہے۔مثال کے طور پر وہ جدید تہذیب کی اندھی تقلید، تعلیمی نظام کی خامیوں اور مذہبی واخلاقی زوال پر ہلکے پھلکے مگر موثر طنز کرتے ہیں۔ایک خط میں اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں۔

''غالباً میری ایسی کوئی تحریر نہیں ہے جو درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہو البتہ کہیں کہیں ظرافتاً کچھ لکھ دیتا ہوں۔میں تو انگلش نیشن کو بہت پسند کرتا ہوں، تم کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجا ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی قومی برائیوں کو بھی مان لیں اور پسند کریں، مثلاً شراب خوری، قمار بازی، خودکشی، عورتوں کی بے حد آزادی، ان باتوں کو وہ خود ہی ناپسند کرتے ہیں۔''

(مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، جمع وتدوین محمد راشد شیخ، ص،۶۳)

بنام شرف الدین احمد خاں صاحب لکھتے ہیں۔

''وحید کی ناکامیابی کا سخت افسوس ہوا۔اس بے چارے پر جو الزام لگایئے میں تو اس قدر زیادہ ناکامیابیوں کو سررشتۂ تعلیم کی پولٹیکل پالسی سمجھتا ہوں۔''

(رقعاتِ اکبر، مرتبہ محمد ہمایوں بی،اے، ص۱۰۳)

اکبرالہ آبادی کے خطوط میں موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔اکبرالہ آبادی کے خطوط میں تعلیم وتربیت کا موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے۔وہ تعلیم کو محض روزگار کا ذریعہ نہیں سمجھتے، بلکہ اسے اخلاقی، فکری اور تہذیبی بیداری کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔اکبر کے نزدیک تعلیم کا مقصد کردار سازی اور شعور کی بیداری تھا۔وہ مغربی طرزِ تعلیم کی ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں تھے، بلکہ اس کے منفی اثرات سے خبردار بھی کرتے تھے۔اپنے بیٹے کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''میں دیکھتا ہوں کہ اونچے گھروں سے تحصیلِ علم وفن کی قابلیت ہی جاتی رہی ہے، کوشش ہوتی ہیں مگر نا کامیابی ہوتی ہے۔ہاں پوری کوششیں استقلال کے ساتھ ہوں تو کچھ نہ کچھ نتیجہ نکلے۔کوئی کہے گا کہ اس کی ضرورت ہی کیا ہے، سلطنت نہیں کرنی اور روٹی خدا نے دے ہی رکھی ہے، جو نوکری پیشہ ہیں وہ اس میں الجھیں۔''

(مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، جمع وتدوین، شیخ محمد راشد شیخ، ص۷۵)

اکبرالہ آبادی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کو لازم قرار دیتے ہیں۔وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر تعلیم سے اخلاقی قدریں اور انسانی ہمدردی ختم ہو جائے تو ایسا علم معاشرے میں فساد پیدا کر سکتا ہے۔اس لیے وہ اپنے خطوط میں بار بار نصیحت کرتے ہیں کہ نئی نسل کو صرف ذہنی علم ہی نہیں بلکہ دل کی پاکیزگی اور کردار کی پختگی بھی سکھائی جائے۔لکھتے ہیں۔

''خوش مزاجی، خوش اخلاقی، رحم دلی عمدہ صفت ہے۔اگر یہ نہیں تو تعلیم غارت ہے۔تم بہت پچھتاؤ گے اگر میری اطاعت نہ کرو

گے۔ میرا دشمن مجھ کو اس قدر تکلیف نہ دیتا جس قدر تم نے دے رکھا ہے۔عشرتی! عزت پیدا کرو، روپیہ پیدا کرو پھر دنیا پڑی ہے عیش آرام کرنا''

(مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، جمع وتدوین شیخ محمد راشد، ص۱۲۴)

مرزا ہادی عزیز لکھنوی کو لکھتے ہیں۔

''اخلاقی حالت ملک روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہے۔ دولت اور علم باطن کی کمی کا اقتضاہی یہ ہے۔''

(مکاتیبِ اکبر، ص۶۸)

اکبر الہ آبادی کے خطوط صرف ذاتی مراسلت یا خیالات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنے عہد کے معاشرتی رویوّں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اکبر الہ آبادی عورتوں کی تعلیم یا آزادی کے خلاف نہیں تھے، بلکہ اس مخصوص تربیت اور آزادی کے خلاف تھے جو پردے اور تہذیبی حدود کو پامال کرتی ہو۔ لکھتے ہیں۔

''پردے کی رسم میں بہت فوائد ہیں بڑا آرام ہے اور ابھی تو ہم میں وہ شرافتِ نسبی کا نشان سمجھا جاتا ہے اور میں عادتاً اس کا حامی ہوں، لیکن زمانے کی تبدیلیوں اور بندگانِ خدا کی ضرورتوں کو جوان تبدیلیوں سے پیدا ہوتی ہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یا تو زمانہ واپس آئے اور یا ان رسموں کو واپس لے۔''

(مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، جمع وتدوین شیخ محمد راشد، ص۷۸)

''میری رائے میں جن لوگوں کو پردہ منظور نہ ہو، وہ لڑکیوں کو اسکول بھیج کر تعلیم دیں اور بچپن ہی سے ان کو بے پردگی کا خوگر کریں۔''

(مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، جمع وتدوین شیخ محمد راشد، ص۷۲)

اکبر نے بے پردگی کو محض اخلاقی کمزوری نہیں بلکہ فکری بدحواسی بھی قرار دیا ہے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبر کے خطوط میں شوخی، ذکاوت اور طنز ومزاح کی ایسی فراوانی پائی جاتی ہے کہ ہر سطر میں ان کے فن کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ بعض جملے اس قدر پراثر ہیں کہ انہیں بلاشبہ اعلیٰ درجے کی نثر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ ان کے اسلوب میں سب سے زیادہ جھلکنے والی صفت ذکاوت ہے، جبکہ رعایت لفظی ان کے مزاج میں اس طرح پیوست ہے کہ کسی بناوٹی کوشش کے بغیر ہی، ان کے قلم سے خود بخود ایسے جملے نکلتے ہیں جو الفاظ کی چابکدستی اور معنویت کی گہرائی کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔

''جون نے جان چھوڑ دی تو جولائی میں شاید ملنا ہو۔''

(خطوطِ مشاہیر، عبدالماجد دریا آبادی، ص،۱۲۲)

''اختصار شب وصل کا آپ نے خوب خیال کیا۔ اس کے جواب میں یہ لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ اگر میرا خط شب وصل سے زیادہ مختصر تھا، تو یہ سبب کہ وصل ملاقات ہے اور المکتوب نصف الملاقات مشہور ہے، لہٰذا میرا خط نصف شب وصل تھا۔''

(رقعاتِ اکبر، محمد نصیر ہمایوں، ص،۷۹)

رعایت لفظی کے ذریعے پیدا کردہ ظرافت کے علاوہ، اکبر الہ آبادی کے خطوط میں نفیس، شائستہ اور بامقصد مزاح کے متعدد دلکش نمونے ملتے ہیں۔ یہ مزاح محض تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ اپنی تہوں میں گہرے سماجی اور فکری پیغامات سموئے ہے۔

''زیادہ پڑھ نہیں سکتا، کتابوں کے دریا امڑے ہیں، اور میں نے اب تک عقل سیکھ کر کیا کیا اور آئندہ کیا کروں گا۔''

(خطوطِ مشاہیر، عبدالماجد دریا آبادی، ص، ۸۸)

''استغفر اللہ۔ نہ میری زبان۔ نہ میرا خیال۔ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں خرافات بک کر میرے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مجھ کو اس لغو کی مطلق خبر نہیں۔ آپ فوراً تردید کر دیجئے۔ بلکہ اخبار میں چھپوا دیجئے۔ مجھ کو بے حد غصہ آیا۔ اور افسوس ہوا۔ آپ کو تو فی الفور تکذیب و تردید کر دینی چاہیئے تھی۔ کہ اسلوبِ سخن پکار رہا ہے کہ میں اس کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ میں تو پڑھ بھی نہیں سکا نہ سمجھ سکا۔''

(مکاتیبِ اکبر، بنام لسان الہند عزیز لکھنوی، ص۱۱۴)

بطورِ شاعر، اکبر الہ آبادی اردو ادب کے صفِ اول کے طنز نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کی طرح ان کے خطوط بھی تیز و موثر طنزیہ نشتر سے مزین ہیں، جن میں معاشرتی بے راہ روی، اخلاقی انحطاط اور زمانے کی ناہمواریوں پر نہایت چابکدستی سے چوٹ کی گئی ہے۔ یہ طنز محض تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ اصلاحِ معاشرہ کا موثر وسیلہ ہے، جو قاری کو ہنسی کے پردے میں سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

''یونیورسٹی کا میں ایسا ہی خیر خواہ ہوں جیسا انگریزی عملداری کا۔ یونیورسٹی ہماری تکمیلِ نفس بلکہ تکمیلِ انسانیت کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جس طرح انگریزی عملداری ہم کو مہذب انسان بنانے کے لیے ضروری تھی۔ یونیورسٹی قوم کے لیے ضروری نہ ہوتی تو لندن سے صدا کیوں اٹھتی اور ہمارے رئیس اس کے لیے کیوں دوڑتے۔ ہماری سمجھ جو مشرقی لٹریچر اور ہمارا مزاق جو دیرینہ عادت پر مبنی ہے، معیار صحیح نہیں ہے۔ اس رنگ کو نیا خون خوب سمجھتا ہے۔ اس کو مزا بھی آئے گا، ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔''

(مکاتیبِ اکبر، بنام عزیز لکھنوی، ص، ۶۵)

اکبر کے خطوط ان کی شخصیت کی نہاں خانوں کو یوں منور کرتے ہیں کہ قاری پر ان کی قناعت پسندی، گوشۂ نشینی اور انکساری کی چھاپ گہری ہو جاتی ہے۔ وہ فطرتاً ایسے انسان تھے جو دل آزاری کو گناہ سمجھتے اور حتی المقدور اختلاف سے گریز کرتے۔ اگر کبھی کاتبِ تقدیر کے قلم سے ان سے کوئی جملہ بھی جاتا تو فوراً اگلے ہی خط میں نہایت انکسار اور نرمی کے ساتھ معافی کے خواستگار ہو جاتے۔ ان خطوط سے یہ بھی متشرح ہوتا ہے کہ ان کی دلچسپیاں صرف شخصی یا ادبی نہ تھی بلکہ وہ ملکی سیاست، معاشرتی اور تصوف کی باریک دنیا میں بھی عمیق بصیرت رکھتے تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صاحب کو لکھتے ہیں

''مجھ کو تو اس بات پر فخر ہے کہ آپ نے محض قابلیت سے اعتبار پیدا کیا اور ترقی حاصل کی، کبھی آپ کو تماشا گروں کے اسٹیج پر نہیں دیکھا۔ میرا اصول یہی تھا اور ہے۔''

(رقعاتِ اکبر، محمد نصیر ہمایوں، ص۶۱)

''ہندوستان کا پالیٹکس بہت پیچیدہ، مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے۔ اردو یونیورسٹی بھی اسی میں داخل ہے۔ ہندو کا ہوم رول اور ذوق ہندی بھی اسی میں داخل ہے۔''

(خطوطِ مشاہیر، عبدالماجد دریا آبادی، ص۱۲۱)

زبان و بیان کی نزاکت اور سلاست کے لحاظ سے اکبر کے خطوط نہایت دلکش اور آفرین ہیں۔ انہوں نے اپنے مکاتیب میں سادہ، شستہ اور بے ساختہ اسلوب اپنایا، جس میں بناوٹ یا تصنع کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ القاب و آداب میں بھی انہوں نے حد درجہ سادگی برتی، اور جو کچھ لکھا پوری بے تکلفی اور قلبی وارفتگی کے ساتھ تحریر کیا۔ ان کا طرزِ مکالمہ ایسا دلنشین اور اپنائیت سے بھر پور ہے کہ پڑھنے والا خود کو مخاطب کے قریب محسوس کرتا ہے۔

''سادگی اور بے ساختگی مکاتیبِ اکبر کی سب سے بڑی خوصوصیت ہے۔ یہ خطوط نہ تو دل لگا کر لکھے گئے نہ ہی اشاعت کا خیال اکبر

کے ذہن کے کسی کونے میں موجود تھا۔اس لئے وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے لکھ ڈالتے تھے۔اور اگر ان میں کسی ذہنی تحفظ کو دخل تھا تو محض اس قدر کہ اکبر کی تربیت ایک خاص فضا اور ماحول میں ہوئی تھی۔اسے سادہ لفظوں میں قدیم تہذیبی ماحول کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس قدیم شائستہ ماحول کا خاصہ یہ تھا کہ اگر کسی کے خلاف کچھ کہا جا سکتا ہے تو ایسے شائستہ لہجے میں کہ اسے برا معلوم نہ ہو۔"

(اکبرالہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا،ص،۳۲۲)

اکبرالہٰ آبادی کی شخصیت اور فکر کا ایک نمایاں پہلوان کا زبان و بیان پر غیر معمولی عبور ہے۔انہیں انگریزی الفاظ وتراکیب کے برمحل اور برمحصول استعمال کا خاصا شوق تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور خطوط میں جا بجا انگریزی الفاظ کا حسین امتزاج ملتا ہے جو نہ صرف ان کے فن میں جدّت اور تازگی پیدا کرتا ہے بلکہ ان کے عہد کی بدلتی ہوئی تہذیبی اور فکری فضاء کا بھی آیئنہ دار ہے۔اکبر نے انگریزی زبان کو محض نمائشی طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اسے طنز و مزاح، فکری معنویت اور تہذیبی شعور کے ساتھ جوڑ کر ایسا رنگ پیدا کیا جو اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ان کے خطوط اور اشعار میں انگریزی الفاظ کا استعمال قاری کو ایک طرف شگفتگی اور تازگی بخشتا ہے تو دوسری طرف اس دور کے سماجی وتہذیبی تغیرات کی جھلک بھی پیش کرتا ہے۔یہی خصوصیت اکبرالہٰ آبادی کو اردو کے دیگر مزاحیہ شعرا اور مکتوب نگاروں سے ممتاز بناتی ہے۔

اکبر کے خطوط بظاہر ظرافت اور مزاح سے لبریز ہیں۔لیکن ان میں ایک سنجیدہ پیغام بھی نفسِ نفیس موجود ہیں۔ان کے خطوط میں سادگی بیان،فطری شگفتگی اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔جو قاری کے دل میں اثر چھوڑتا ہے۔اکبر کی تحریر اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ ادب میں سنجیدگی اور مزاح ایک ساتھ چل سکتے ہیں،اور اصلاح کا پیغام خوشگوار پیرایہ میں بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔ان کے خطوط آج بھی وہی معنویت رکھتے ہیں،جوان کے عہد میں تھی، بلکہ آج کے بدلتے ہوئے سماجی منظر میں اور بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکبرالہٰ آبادی نے شاعری اور نثر، دونوں میدانوں میں اپنی انفرادیت قائم کی اور اردو ادب کو ایسا سرمایہ عطا کیا جو ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گا۔

<u>کتابیات</u>

۱۔اردو مکتوب نگاری،شاداب تبسم

۲۔اکبرالہٰ آبادی،طالب الہٰ آبادی

۳۔اکبرالہٰ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

۴۔رقعاتِ اکبر،محمد نصیر ہمایوں بی،اے

۵۔مکاتیبِ اکبر

۶۔مجموعۂ مکاتیبِ اکبر،جمع وتدوین محمد راشد شیخ

۷۔خطوطِ مشاہیر،عبدالماجد دریا آبادی

اکبرالہ آبادی: کثیرالجہات شخصیت

اکبرالہ آبادی لسان العصر کا لقب حاصل کرنے والے نہ صرف ایک مشہور ومعروف شاعر ومکتوب نگار کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں بلکہ ان کی شخصیت مصلح قوم، خوش مزاج وخوش خلق، قوم پرست، حب الوطنی کے جذبات سے لبریز مختلف النوع صفات کی حامل ہے جو ان کی شعری ونثری تخلیقات کے ذریعہ بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک تو اچھی شاعری ہی اپنے آپ میں ایک بہت پیچیدہ اور دقیق کام ہے اور اس میں طنزیہ انداز میں مزاح کے پیرائے شاعری کرنا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے لیکن اس کام کو اکبر نے بخوبی انجام دیا۔ ایک عام انسان کے برعکس شاعر وادیب وقت کے تقاضے، درپیش آنے والے مختلف مسائل کے حل تلاش کرنے کے سلسلے میں زیادہ دوربین اور دوراندیش ہوتے ہیں۔ کسی بھی شاعر وادیب کے کلام کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے اس کے عہد و ماحول سے واقف ہونا از حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کے کلام کو پوری طرح سمجھنا ناممکن ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ملک ہندوستان پوری طرح انگریزوں کے شکنجے میں آچکا تھا، انگریزیت ملک پر بھرپور طریقہ سے حاوی تھی اور ہندوستانی بھی انگریزی تہذیب کی فخریہ طور پر اندھی تقلید کر رہے تھے مشرقی تہذیب کا وجود پوری طرح خسارے میں نظر آرہا تھا اور اسی مشرقی تہذیب کے وجود ووقار، اس کی شناخت کو برقرار رکھنے کے احساس کو بیدار کرنے کا کام اکبرالہ آبادی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ کیا ہے۔ وزیر آغا اس عہد کے رجحانات پر یوں رقمطراز ہیں:

> ''یہ دور مختلف رجحانات کے تصادم کا دور تھا تاہم اس دور میں مغربی تہذیب کو اپنانے کی روش ہی سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ صدیوں کے منجمد معاشرے میں یکا یک ایک ایسا اندرونی تموج پیدا ہو گیا تھا کہ ملک کا باشعور طبقہ اندھا دھند مغربی افکار کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کا مقلد بھی ہونے لگا تھا جذباتیت کی رو اپنے عروج پر تھی ایک طرف وہ لوگ تھے جو کسی تبدیلی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو اپنی روایت اور تہذیب کا دامن چھوڑنے پر آمادہ تھے ان دونوں طبقوں کا انداز کسی نہ کسی حد تک جذباتی تھا'' [1]

اکبرالہ آبادی کا دور بحرانیت کا دور تھا۔ اس بحرانی دور میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیاں اور تغیرات ان کی شاعری میں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی ایک طنز ومزاح نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں مشہور ہیں لیکن ان کا طنزیہ ومزاحیہ ادب محض ہنسنے ہنسانے اور چٹکلے بازی کے لئے نہ ہو کر ایک مقصدی اور سنجیدہ پیغام ہے چونکہ وہ ایک سرکاری ملازم تھے اس لئے اپنے انداز میں طنز ومزاح کو اپنے خوش مزاج شخصیت کے ساتھ وقت کے تقاضے اور موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اپنایا۔ انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ انداز میں غزل، نظم، رباعی، قطعہ وغیرہ شاعرانہ کلام پیش کیا۔ ان کے عہد کے تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی رجحانات کی عکاسی ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ ایک سرکاری پینشن خوار ہوتے ہوئے بھی انہوں نے انگریزی سامراج کے جبر واستبداد اور ملک میں انگریزی حکومت کے استحصال کے خلاف انہوں نے طنزیہ انداز میں بڑی چابکدستی سے آواز بلند کی:

اگرچہ ظلم سے دل مائل فریاد ہوتا ہے
مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے

اکبر کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا۔ ان کی غزلوں میں شوخی وظرافت کا رنگ غالب ہے۔ ان کی غزلوں کا خاص موضوع عشق ہے۔ اس کے علاوہ فانی دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی ناہمواری ودشواری اور تصوف کے موضوعات پر بھی غزلیں کہی ہیں۔ عشق کی شدت ملاحظہ ہو:

میرا سوز دل آپ کیا دیکھتے ہیں
یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے

ان کی بنیادی تعلیم مذہبی تھی۔ دینی ماحول باپ دادا سے وراثت میں ملنے کے باعث ان کی طبیعت بھی تصوف کی طرف مائل تھی اس لئے ان کی شاعری میں تصوف کے وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں نظریے بھی ملتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاذیہ غلام انصاری، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، پریاگ راج

الٰہی کیسی کیسی صورتیں تو نے بنائی ہیں
کہ ہر صورت کلیجے سے لگا لینے کے قابل ہے

ہر ذرہ چمکتا ہے انوار الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

ہندوستان میں مغربیت جس طرح حاوی ہورہی تھی اور ملک وقوم کے لوگ مغربی تہذیب وتمدن کو جس طرح آنکھ بند کر کے اختیار کررہے تھے اس کے متعلق اکبر کے ذہن میں اپنی مشرقی تہذیب کے وجود کے زوال اور پستی کے سلسلے میں بہت سے خدشات پیدا ہورہے تھے لیکن انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ کوئی بھی قوم بغیر تعلیم حاصل کیئے کبھی بھی ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہوسکتی اس لئے انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے ۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اُٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواصِ خشک و تر سیکھو علومِ بحر و بر سیکھو

نوجوانوں میں جوش بھرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۔

خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

انہوں نے اپنے اس خیالات کو واضح کرتے ہوئے ان لوگوں سے سوال بھی کیا ہے جو کہ ان کو تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں ۔

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ، عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر ، حسرتِ لندن پیدا

اکبر کو اس بات کی فکر لاحق رہتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے غیر معتدل طریقے سے انگریزی تہذیب کو اختیار کرتے ہوئے ہماری قوم کے لوگ اپنے محدود دائرے کو بھول نہ جائیں اور لامحدود طریقے سے غیر ملکی قوم کے رہن سہن، طور طریقے، عادت واطوار، لباس، تہذیب وتمدن میں خود کو ملبوس کر کے اپنے مذہب، اقدار، عظمت اور شناخت کو کھو بیٹھیں اور اپنے اسی خدشات کی بنا پر انہوں نے اپنی شاعری کے ایک خاص موضوع 'تعلیم نسواں' پر زور دیتے ہوئے عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ان کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ غیر تعلیم یافتہ عورت کبھی بھی امور خانہ داری کو بخوبی انجام نہیں دے سکتی۔ صغریٰ مہدی اپنی کتاب 'اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' میں اکبر کے تعلیم نسواں کے نظریے کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''وہ عورتوں کی تعلیم کے تو مخالف نہیں تھے، مگر اس حق میں تھے کہ عورتوں کو وہ تعلیم حاصل کرنا چاہئے جو امور خانہ داری بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہو۔''[2]

شاعری میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوانے والے اکبرالہ آبادی نے نثر کے میدان میں بھی گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ بطور خطوط نگار اردو نثر میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ اکبر نے اپنے خطوط میں مختلف موضوعات پیش کئے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں بھی مزاحیہ انداز میں ایک سنجیدہ مقصد کے تحت اخلاقی پستی، معاشرتی خرابیوں، مذہبی زوال، عورت کی آزادی اور پردہ، اخلاقی قدروں کی پامالی جیسے لاتعداد موضوعات کو اجاگر کیا ہے۔ ایک خط میں وہ اپنے بیٹے کو مغربی تہذیب کے منفی اثرات سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے یوں نصیحت کرتے ہیں۔

''غالباً میری ایسی کوئی تحریر نہیں ہے جو درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہو البتہ کہیں کہیں ظرافتاً کچھ لکھ دیتا ہوں۔ میں تو انگلش نیشن کو بہت پسند کرتا ہوں، تم کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجا ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی قومی برائیوں کو بھی مان لیں اور پسند کریں، مثلاً شراب خوری، قمار بازی، خودکشی، عورتوں کی بے حد آزادی، ان باتوں کو وہ خود ہی ناپسند کرتے ہیں۔''[۳]

عورت کے پردے کے متعلق اکبر نے عورت کی بے پردگی کو بدحواسی اور شرمندگی کا باعث بتاتے ہوئے شعر کے پیرائے میں یہ کہا ہے کہ

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

تو دوسری طرف انہوں نے نثری انداز میں اپنے خطوط میں عورت کے پردے کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا ہے۔

''میری رائے میں جن لوگوں کو پردہ منظور نہ ہو، وہ لڑکیوں کو اسکول بھیج کر تعلیم دیں اور بچپن ہی سے ان کو بے پردگی کا خوگر کریں۔''[۴]

اس طرح اکبر نے شاعری اور نثر دونوں میدان میں طنز و مزاح کے پیرائے میں نہایت ہی سادگی و سلاست کے ساتھ وسیع موضوعات کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ پیش کیا اور اردو شعر و ادب میں منفرد مقام حاصل کیا۔

کتابیات:

۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، وزیر آغا، ص ۱۰۸، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۹ء
۲۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، ص ۳۷، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء
۳۔ مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، مرتب کردہ محمد راشد شیخ، ص ۶۳
۴۔ مجموعۂ مکاتیبِ اکبر، مرتب کردہ محمد راشد شیخ، ص ۲۷

اکبرالہ آبادی کا تصور تعلیم نسواں اور معاشرتی اصلاح

برصغیر ہند میں ۱۹ رویں اور ۲۰ رویں صدی کا عہد سیاسی سماجی اور تہذیب اعتبار سے غیر معمولی عہد تھا جس میں ہر اعتبار سے ہمہ گیر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو سیاسی اقتدار سے محرومی کے ساتھ ساتھ تہذیبی وفکری زوال کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف انگریزی حکومت کے سخت گیر رویے تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کی عملی اور تعلیمی پسماندگی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا ایسے پُر آشوب ماحول میں علی گڑھ تحریک کے ذریعے جدید تعلیم کی اہمیت پر زور دیا اور مسلمانوں کو مغربی علوم سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سوال سب سے اہم تھا کہ تعلیم کا تعلق عورتوں سے کس حد تک جوڑا جائے۔ کیونکہ ہندوستانی روایتی معاشرت میں تعلیم نسواں کو ہمیشہ سے شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اکبرالہ آبادی جیسے شاعر سامنے آتے ہیں اور اپنے مخصوص طنزیہ ومزاحیہ اشعار کے ذریعے اسی مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی کی شاعری کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں:

> ''اکبر کی شاعری کے کمال عروج وشہرت کا زمانہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی ہے لیکن ان کی اصلاحی شاعری کی بنیاد انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ اور خاصے مشہور وہ بیسویں صدی کے شروع ہی سے ہو چکے تھے۔''[۱]

اکبرالہ آبادی کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا اور وہ ۱۸۴۶ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل اور بعد میں جج کے منصب پر فائز ہوئے۔ اکبر جدید علوم وفنون کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی اصل فکر اپنی تہذیب وروایت کے تحفظ سے تھی وہ مشاہدہ کر رہے تھے کہ مغربی تہذیب کے گہرے اثرات ہندوستانی معاشرے کی روایتی ساخت کو تیزی سے تبدیل کر رہے ہیں۔ اور اس معاشرتی تبدیلی کے عمل میں سب سے نمایاں خطہ خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی اور تعلیمی پیش رفت کو لاحق تھا۔

اکبر جس عہد میں آنکھیں کھولی اس عہد کا ذکر اکبرنامہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کچھ اس طرح سے رقمطراز ہیں:

> ''مسلمانان ہندوستان میں عین یہی زمانہ مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج مقبولیتوں کے فروغ کا زمانہ ہے اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں۔''[۲]

ہندوستان میں مغربی تہذیب کے اثرات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ مغربی تہذیب کی نقالی میں عورتیں سب سے آگے تھیں۔ اکبر نے اپنی شاعری میں اسی کشمکش کو طنز اور مزاح کے رنگ میں ڈھالا اور یہی ان کی انفرادیت ہے کہ وہ محض ہنسانے کے لئے نہیں لکھتے تھے بلکہ ہر شعر کے پیچھے ایک گہری فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ دراصل اکبرالہ آبادی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عورت کو تعلیم ملنی چاہئے لیکن یہ تعلیم اس کی گھریلو اور اخلاقی ذمہ داریوں سے ہم آہنگ ہو۔

خواتین کی انگریزی تعلیم کی مخالفت درحقیقت تعلیم نسواں کے خلاف نہ تھی بلکہ مغربی تہذیب اور اس کے خیال کیے جانے والے منفی اثرات کے خلاف تھی۔

اکبر اپنی تہذیب اور مشرقی اقدار کے دل دادہ تھے وہ چاہتے تھے کہ عورتیں ایسی تعلیم حاصل کریں جو ان کے اخلاق وکردار کو نکھارے۔ وران کے گھریلو اور معاشرتی فرائض کو بہتر بنائے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو باشعور، بااخلاق اور بہترین ماں اور بیوی ہونا چاہئے نہ کہ صرف فیشن پرست۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں طنز ومزاح کے پردے میں ایک سنجیدہ فکری پیغام ملتا ہے ان کی شاعری میں تعلیم نسواں پر جو اشعار ملتے ہیں وہ صرف عورتوں کی مخالفت میں نہیں بلکہ اصلاح معاشرہ، اپنی تہذیب کی حفاظت کے پیش نظر ایک کوشش ہے۔

اکبرالہ آبادی اپنی شاعری اور فکر سے ہمیشہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ محض دنیاوی ترقی انسان کے لئے کافی نہیں ہے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید تعلیم ضرور حاصل کریں مگر اس کے ساتھ ساتھ اپنے دینی تشخص کو بھی محفوظ رکھیں۔ ان کے نزدیک اصل کمال یہ ہے کہ انسان علم وہنر میں ترقی کرے لیکن اللہ اور ان کے رسول کی تعلیمات سے غافل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار اپنی شاعری میں یاددہانی کراتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں کھیلو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندہ عاجز کا ہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

یہ اشعار اکبر کی اس فکر کو واضح کرتے ہیں کہ تعلیم کے میدان میں ترقی بہت اہم ہے لیکن اس کی قیمت ایمان اور دینی شعور کے نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑے تو ایک خسارے کا سودا ہے۔

اکبرالہ آبادی کے نزدیک تعلیم نسواں وقت کی ضرورت تھی لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم نسواں کا مقصد عورت کو پردہ اور اسلامی اقدار سے آزاد کر دینا نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے نزدیک

گل شمع بانو، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد

عورت کے لئے پردہ محض ایک رواج نہیں بلکہ اس کی عزت وعفت اور معاشرتی توازن کی علامت تھی۔ وہ بار بار اس خطرے کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگر تعلیم صرف مغربی رنگ ڈھنگ اپنانے کا ذریعہ بنے تو یہ دراصل اسلام کے خلاف ایک بگاڑ ہوگا۔ اسی تناظر میں اکبر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

تعلیم لڑکیوں کو جو دی تم نے اے حکیمو
اسلام کا ہوا ہے یہ صلہ، پردہ اٹھ گیا

اکبر کا یہ شعر اسی بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اکبر کو مغربی تعلیم کی اندھی تقلید پر شدید اعتراض تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ عورت علم ضرور حاصل کریں لیکن ایسا علم جو اس کے اسلامی تشخص کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے نزدیک تعلیم اور پردہ ساتھ ساتھ ہونا چاہئے۔ کیونکہ دونوں مل کر ہی عورت کے مقام و مرتبے کو بلند کرتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ معاشرت کی بنیاد عورت کے کردار پر قائم ہے اگر عورت اپنی عصمت وعفت کا لحاظ رکھتی ہو تو گھر، خاندان اور پورا معاشرہ سنور جاتا ہے اور اگر مغربی رنگ وڈھنگ کی نقالی میں ڈوب جائے اور اپنی عصمت وعفت کا خیال نہ رکھیں تو بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ اسی لئے اکبر نے بار ہا اپنی شاعری میں مغربی اور مشرقی عورت کا تقابل کیا ہے۔ ان کے نزدیک مشرقی عورت کی عظمت اس کی سادگی، حیا اور گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی میں تھی جب کہ مغربی عورت زیادہ تر نمود و نمائش، فیشن پرست اور آزادی کے نام پر گھر سے بے تعلق نظر آتی تھیں۔

اکبر اس فرق کو بڑے دلکش اور نکتہ سنج انداز میں بیان کرتے ہیں ان کے نزدیک مغربی عورت کا حسن عارضی آرائش اور بناوٹ میں چھپا تھا جب کہ مشرقی عورت کی کشش خلوص و محبت اور گھریلو خوشبو میں جو شیدہ تھی وہ ایک جگہ بڑی خوبی سے اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی عورت کے لئے عطر و پرفیوم لازمی ہے لیکن مشرقی عورت کا حسن حنا، چاندی کی چوڑیاں اور گھریلو پن میں ہے۔ اسی ضمن میں اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں کہ:

ہر چند کہ ہے مس کالونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کے بھی سن سن ہوش انگیز ہے لیکن
شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگریزی سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن، پہلے چراغِ خانہ تھی

یہ شعر بظاہر ہلکا پھلکا اور مزاحیہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے اندر ایک سنجیدہ سماجی حقیقت پوشیدہ ہے۔ ''چراغ خانہ'' سے مراد وہ عورت جو گھر کی رونق سکون کا مرکز تھی وہ اپنے خاندان کی تربیت اور گھر کی فضا کو سنبھالنے میں فخر محسوس کرتی تھی لیکن ''شمع انجمن'' کہہ کر اکبر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تعلیم اور مغربی اثرات نے عورت کو گھریلو حدود سے نکال کر محفلوں اور نمائش کا حصہ بنا دیا ہے۔ جہاں اس کی اصل ذمہ داریاں پس پشت چلی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور شعر قابل ذکر ہے۔

پردہ توڑا آپ نے اس بت کو آیا کر دیا
خود پری تھی، آپ نے پریوں کا سایہ کر دیا

یہ شعر دراصل ان کی خواتین پر طنز ہے جنہوں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پردے کو بوجھ سمجھ کر چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو آزادی کے نام پر ظاہر کرنے لگیں۔ اکبر کہتے ہیں کہ پردہ جو کبھی عفت واحترام کی علامت تھا تعلیم یافتہ عورتوں نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور اسے بے وقعت کر دیا۔ ''پریوں کا سایہ'' کہہ کر وہ مغربی تہذیب اور اس کے دل فریب انداز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جسے دیکھ کر عورتیں اپنی اصل شناخت بھولنے لگیں۔ اسی طرح ایک اور شعر قابل ذکر ہے۔

ان سے بیوی نے فقط اسکول کی ہی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اس شعر میں اکبر ایک عام گھریلو حقیقت کو انتہائی سادگی مگر گہرے طنزیہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ تعلیم یافتہ عورت جب شوہر سے بات کرتی ہے تو وہ اسکول یا تعلیم سے متعلق گفتگو پر زیادہ زور دیتی ہے، لیکن وہ گھر کے بنیادی کام جیسے کھانے پینے، یا گھر سنبھالنے کی بات بھول جاتی ہے۔ اکبر دراصل اس بات پر متوجہ کر رہے ہیں کہ عورت اگر تعلیم یافتہ بھی ہو تو اسے اپنے گھریلو ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

اکبر کا مقصد عورت کو تعلیم سے محروم کرنا نہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ عورت تعلیم حاصل کر کے صرف فیشن پرست نہ بنے بلکہ ایک پاکیزہ بیوی، ماں اور بہن کا عملی نمونہ پیش کرے۔ اس ضمن میں صغریٰ مہدی لکھتی ہیں کہ:

''اکبر کہتے ہیں کہ میں عورتوں کی تعلیم کا مخالف نہیں انھیں تعلیم ملنی چاہیئے انھیں مذہب سے واقفیت ہونا بھی ضروری ہے حفظان صحت کے اصولوں سے بھی انھیں واقف ہونا چاہیئے حساب کتاب بھی آنا چاہیئے اور اخلاق اور سبق آموز کتابیں ان کے مطالعے میں رہنی چاہیں تا کہ وہ اپنے بچوں کو اچھی تربیت کر سکیں۔''[۳]

اکبرالہ آبادی کے ناقدین میں بعض نے انہیں رجعت پسند اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا ہے ان کے نزدیک عورت کو محض گھر کی چہار دیواری تک محدود رکھنے کے قائل تھے۔اور وہ عورت کی آزادی یا سماجی کردار کو تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن خاکسار کی نظر میں ایسا نہیں ہے بلکہ وہ عورت کی بنیادی خوبیوں اور صفات کے قائل تھے وہ مغربی تہذیب سے اختلاف رکھتے تھے نہ کہ تعلیم نسواں۔صغریٰ مہدی اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:

''وہ عورتوں کی تعلیم کے تو مخالف نہیں تھے، مگر اس حق میں تھے کہ عورتوں کو وہ تعلیم حاصل کرنا چاہیئے جو امور خانہ داری بچوں کی تربیت اور شوہر کی رفاقت میں معاون ثابت ہو۔''[۴]

اس ضمن میں ایک شعر قابل ذکر ہے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی فکر آج کے دور میں بھی اپنی معنویت رکھتی ہے۔آج جب عورت ہر شعبے میں ترقی کر رہی ہے اور تعلیم نے اس کے لئے بے شمار دروازے کھول دیے ہیں تو یہ سوال اب بھی اہم ہے کہ کیا ہماری تعلیم عورت کو صرف معاشی دوڑ میں آگے بڑھنے کا ہنر سکھا رہی ہے؟ اکبر کا پیغام یہی ہے کہ تعلیم کا مقصد ہمہ جہت ترقی ہونا چاہیئے۔

تعلیم سے عورت اگر سائنس، سیاست اور معیشت کے میدان میں کامیاب ہوتی ہے تو یہ خوش آئند۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر وہ اپنے اخلاق، کردار اور معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہے تو یہی حقیقی خامیابی ہوگی۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے اپنے دور کی سب سے اہم بحث یعنی تعلیم نسواں میں ایک منفرد اور گہری آواز شامل کی،ان کا طنز اور مزاح محض دل لگی کے لیے نہیں بلکہ ایک فکری تنبیہ کے طور پر ہے وہ ہمیں یہ بھی سمجھاتے ہیں کہ تعلیم کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہونا چاہیئے لیکن اس تعلیم کو اپنی تہذیبی اور اخلاقی بنیادوں کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا ضروری ہے۔اکبر کی شاعری آج بھی ہمارے لئے ایک آئینہ ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ ترقی کی دوڑ میں اپنی پہچان اور اقدار کو فراموش کرنا سب سے بڑی ناکامی ہے۔

حواشی:

۱۔ اکبر نامہ، از مولانا عبدالماجد دریابادی، ص۹۳
۲۔ ایضاً
۳۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص۳۷
۴۔ ایضاً ص۴۷۔۳۷

اکبرالہ آبادی کا فکروفن

لسان العصر۔اکبرالہ آبادی کا اصل نام اکبرحسین اور تخلص اکبر تھا۔وہ ١٦ نومبر ١٨٤٦ء کو بمقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام تفضّل حسین تھا۔ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں پائی۔آگے چل کر محکمہ تعمیرات میں ملازمت کی۔١٨٦٩ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوئے۔١٨٧٢ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔١٨٨٠ء تک وکالت کرتے رہے پھر منصف مقرر ہوئے۔١٨٩٤ء میں عدالت خفیہ کے جج بن گئے۔١٨٩٨ء میں جوڈیشری خدمات کے عوض ''خان بہادر'' کا خطاب ملا اور ١٩٠٣ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

اکبرالہ آبادی کی زندگی کے آخری ایام دشوار گزار رہے۔١٩١٠ء میں تیسری بیوی کے انتقال کے بعد ان کا چھوٹا بیٹا صرف ١٣ برس کی عمر میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوا۔جس کے بعد اکبر بالکل ٹوٹ سے گئے۔اکبر کے آخری دنوں کے دکھ کا اندازہ ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

اب میری زندگی نہیں نور انبساط
یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی
شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم کو کیا تعلق
وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں
ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قید ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

اکبرالہ آبادی خود کو موت کے قریب دیکھ رہے تھے۔وہ مذہبی آدمی تھے،اس لئے موت پر یقین رکھتے تھے۔بالآخر ٩ ستمبر ١٩٢١ء کو ان کا انتقال الہ آباد میں ہوا۔ان کی تصانیف میں ''کلیاتِ اول'' ''کلیاتِ دوم''اور''کلیات سوم'' شامل ہیں۔انتقال کے بعد غیر مطبوعہ کلام کو''کلیاتِ اکبر'' کے نام سے شائع کیا گیا ،جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ان چار کلیات میں مطبوعہ اشعار کی تعداد بارہ ہزار ہے۔علاوہ ازیں اکبر کے خطوط کے تین مجموعے''مکتوباتِ اکبر'' ''خطوطِ مشاہیر''اور''رقعاتِ اکبر''منظر عام پر آچکے ہیں۔

اکبرالہ آبادی اردو کے بہترین غزل گو،صاحب طرز طنز و مزاح نگار اور ممتاز نظم گو شاعر ہیں۔انھوں نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور شاعری کی ابتداء غزل سے کی، جو تغزل سے بھرپور تھی۔ان کے استاد غلام حسین وحید الہ آبادی اپنے عہد کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ان کا تعلق دبستانِ آتش سے تھا۔

غزل کو اظہار عشق و محبت کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔اردو کے مختلف شاعروں کی غزلوں میں عشق و محبت کی سینکڑوں کیفیات دکھائی دیتی ہیں لیکن اکبرالہ آبادی کی غزلوں میں واردات قلبی کے اظہار کے ساتھ محبوب کی خارجیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اس نے پوچھا ہوگیا آسودہ بوسہ لے کے تو
میں نے ناحق کہہ دیا جلدی میں جی ہاں ہوگیا

اس لب شیریں کے بوسوں نے کیا شیریں سخن
لی زبان ان کی جو منہ میں ، میں زباں داں ہوگیا

شعیب نجمی

رقیبوں نے پہلو دبا یا تو چپ
میں بیٹھا تو ظالم سرکنے لگا
بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسہ پر
خوش ہوگئے آخر کو تین چار کے بعد

اس شعر سے زندگی کی یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ برائی کی عادت سے احساس زیاں باقی نہیں رہتا۔لہذا محبوب کی چال بازیوں کا تذکرہ اکبرالہ آبادی نے یوں کیا ہے۔

جب کہیں ملتا ہے کرتا ہے نہ ملنے کا گلہ
اور جو ملنے جاتا ہوں مرد خدا ملتا نہیں

اکبرالہ آبادی کی غزلیں صرف گل وبلبل اورحسن وشباب تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں زندگی کے مختلف پہلو جذب ہیں۔مثلاً مذہبی اقدار سے انحراف کا یہ رنگ دیکھئے۔

جب سنبھالا اس پری پیکر نے کچھ حسن وشبات
شیعہ سنی ہوگئے ہندو مسلماں ہوگئے

بقول آل احمد سرور''ادب لطافت کی چیز ہے''۔اس قول کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی کی غزلوں میں بیشک ایمائیت کی لطافت پائی جاتی ہے۔

بہت مشکل ہے بچنا بادہ ٔ گلگوں سے خلوت میں
بہت آساں ہے یاروں میں معاذ اللہ کہہ دینا
روشن بھی کرو جا کے میہ خانہ کسی کا
ان سے تو کوئی صلح کی صورت نہیں بنتی
آرزو مرگ کی اکبر نہ کر اللہ سے ڈر
تجھ سے عاصی کے لئے قبر میں کیا رکھا ہے

غزل میں پختگی آنے کے بعد اکبرالہ آبادی نے دوسری اصناف کی جانب توجہ کی۔انھوں نے شاعری کی جن اصناف میں طبع آزمائی کی،ان میں غزل،مثنوی،قطعہ،رباعی اورنظم وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹرمحمد زکریااس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''انہوں نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا مگر بعدازاں جوں جوں ان کے کلام میں پختگی آتی گئی وہ اصناف کے تنوع کی طرف بھی زیادہ سے زیادہ میلان ظاہر کرتے رہے۔ان کے ہاں غزل کےعلاوہ قطعہ،مثنوی،رباعی اورمسمط کی مختلف شکلیں مثلاً مثلث،مربع، مخمس،مسدس، ترجیع بند،علاوہ ازیں مستزاد،تضمین،نظم غیرمعریٰ وغیرہ غرض تقریباً تمام مروجہ اصناف نظر آتی ہیں۔اس کے علاوہ ہیتؤں کے بعض ایسے تجربات بھی ملتے ہیں۔جو تمام مروجہ شعری شکلوں سے مختلف ہیں۔''

(ڈاکٹرمحمد زکریا۔اکبرالہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،سنگ میل پبلی کیشن،لاہور۲۰۰۳)

اکبرالہ آبادی کے عہد کے سارے رنگ ان کی شاعری کی قوس قزح میں نظر آتے ہیں۔موضوعات کے اسی تنوع اور رنگا رنگی کے سبب انھیں دیگر ہم عصر شعراء پر فوقیت حاصل ہے۔اس بناء پر انھیں شہنشاہ ظرافت کہا جاسکتا ہے۔مختلف موضوعات کی مناسبت سے اکبرالہ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مذاہب پر اشعار

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالیسی میں اڑ جائے
مذہب کبھی سائنس کو سجدہ نہ کرے گا
انساں اڑیں بھی تو خدا ہو نہیں سکتے

نسوانی آزادی پراشعار

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھے
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید
بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے

نئی تہذیب پراشعار

ہم کو نئی روشنی کے حلقے جکڑ رہے ہیں
باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یوں ہیں کہ گویا آب زم زم مئے میں داخل ہے

سیاست پراشعار

تم ملو نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو
ساتھ رہنا ہے اس ملک میں ائے ہم وطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد
آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

تعلیم پراشعار

علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم
صلح رہتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع
مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ اترائیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

اکبرالہ آبادی نے معاشرے کی ناہمواری کی طرف توجہ کی اورجن موضوعات پرقلم اٹھایاان کو پوری تازگی اورفن کارانہ مہارت کے ساتھ اپنی شاعری میں پیش کیا۔ان موضوعات کے سبب اردوادب میں اکبرالہ آبادی ایک منفرد اورممتاز حیثیت کے مالک نظرآتے ہیں۔ان کے کسی بھی ہم عصر نے ان موضوعات کوطنزیہ ومزاحیہ پیرایہ میں اتنی خوبصورتی سے پیش نہیں کیا۔اکبرالہ آبادی کی شاعری کے تعلق سے وزیرآغا لکھتے ہیں۔

''اکبر پہلے اردو شاعر ہیں جو باقاعدہ طور پراکابر کے طرزعمل اور ہنگامی واقعات پرطنز کی طرف متوجہ ہوئے۔ دراصل یہ زمانہ ہی ایسا تھا، ہماری سیاسی زندگی میں برق رفتار تبدیلیاں پیدا ہورہی تھیں اورایک حساس شاعر کا ہنگامی واقعات سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں تھا۔چنانچہ شاید اس لئے بھی اکبرمرحوم نے بعض معاملات پراپنے

مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح۔وزیر آغا، ناز پبلی کیشن ہاؤس، دہلی۔سن اشاعت ۱۹۷۸۔ص۱۳۰)

اکبرالہ آبادی اپنے عہد کے عروج و زوال کو محسوس کرنے والے وہ حساس شاعر ہیں۔جنھوں نے مزاح نویسی کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اردگرد پرورش پانے والے ان گنت مسائل اور معاشرے کے تلخ حقائق کو اس طرح کھل کر بیان کیا، کہ سننے والا معاشرے کا پسا ہوا طبقہ، جہاں انھیں داد دینے پر مجبور نظر آتا ہے۔وہیں حاکم طبقہ، صرف اور صرف تلملا کر ہی رہ جاتا ہے۔

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے رکھنا
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے
حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہل ہوٹل کو
وہاں قرآن اترا ہے یہاں انگریز اترے ہیں

اکبرالہ آبادی نے انگریزوں کی ہر ایجاد کو طنز کا نشانہ بنایا ہے اور طنزیہ و مزاحیہ انداز میں ان پر خوب نشتر چلائے ہیں۔جب ہندوستان میں ٹائپ اور پائپ آئے تو انھوں نے اس انداز سے ان چیزوں کو طنز کا نشانہ بنایا۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

اکبرالہ آبادی کو قوم کے لیڈروں سے بھی شکایت تھی کیونکہ وہ اپنا وقار اور آزادی چھوڑ کر غلامی کی زنجیروں میں خود کو جکڑ رہے تھے۔وہ عیاشی اور اپنی ہی دھن میں مگن تھے۔جس سے قوم تباہ و برباد ہو رہی تھی۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

اکبرالہ آبادی کے عہد نے اردو ادب کو وطنی شاعری کا سرمایہ دیا۔ان کی شاعری میں نئی تہذیبی سیاست اور بدلتی ہوئی اقدار کا نوحہ ہے۔ان کے طنز و مزاح کے پیچھے نظریات کا کرب ہے۔ان کے ذہن کی تشکیل اسی سیاسی اتھل پتھل کا نتیجہ ہے۔اس لئے اس میں طنز کی کاٹ بھی ہے اور ماضی و مستقبل کی زبان بھی۔شمس الرحمٰن فاروقی اکبرالہ آبادی کی نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ہمارے سب سے بڑے طنز نگار کی حیثیت سے اکبر کی شہرت کو کوئی بٹہ نہیں لگا ہے۔لیکن ان کے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔اردو کے نقادوں نے کم و بیش یک زبان ہو کر ان کی نکتہ چینی کی ہے۔کیوں کہ اکبر انہیں ترقی، سائنس اور روشن خیال طرز فکر و حیات کے دشمن نظر آتے ہیں۔''

(نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار۔شمس الرحمٰن فاروقی، جواہر لال نہرو مارگ، نئی دہلی۔ص۳۴)

اکبرالہ آبادی کا عہد بڑا پر آشوب تھا۔تصادم، مارکاٹ اور خون ریزی عام تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں درد و غم کی کیفیات اور وحشت و خوف کے احساسات کا شدید احساس ملتا ہے۔

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں
میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں

اکبرالہ آبادی مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے ان کا خیال تھا کہ اگر مغربی تہذیب ،مخلوط تعلیم کی صورت میں آئی تو ہندوستانی معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوجائے گا۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہرگز نہیں تھے،بس اپنے حدود میں رہنا،اپنی حقیقت اور اصلیت کو نہ بھولنے کا درس ضرور دیتے تھے۔

پبلک میں ضرور جاکر ٹھنی رہو
تقلید مغربی میں عبث کیوں ٹھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی دیوی بنی رہو
تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ کو چھولو
ہر ایک سخن بندہ عاجز کار ہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبرالہ آبادی کی شاعری میں ایک رجحان قومیت ہے وہ قومی اتحاد پر بہت زور دیتے تھے۔ان کا بنیادی مقصد ملت اسلامیہ کی رگ حمیت کو چھیڑنا اور خواب غفلت سے جگانا تھا تاکہ غربت وافلاس جو مسلمانوں کا مقدر تھا،اس سے قوم کو نجات ملے اور پھر روشن صبح نمودار ہو،ایسی روشن صبح جو پورے معاشرے کی تاریکی کو دور کردے اور فضاء معطر ہوجائے۔ان کے نزدیک ہمارے مذاہب مختلف،زبانیں الگ،رہن سہن جدا ہی کیوں نہ ہوں،لیکن بہ حیثیت مجموعی ہم سب ہندوستانی ہیں۔اسی جذبے کے تحت اکبر ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ختم کرنا چاہتے تھے۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں۔

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زباں وہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں
قومی حالت میں ہندو اور تم ہو یکساں
کیا روک ہے کہ پھر ان کو بھائی نہ کہو
بے شک اس بات پر تعجب ہے بجا
گنگا سے پلو اور اس کو مائی نہ کہو

اکبرالہ آبادی کی شاعری کا ایک اہم موضوع سرسید احمد خاں بھی ہیں لیکن اکبر،سرسید سے نفرت نہیں کرتے تھے بلکہ نظریاتی اور مغرب پرستی کی وجہ سے وہ سرسید کے خلاف رہے۔دونوں کا اختلاف مشرق اور مغرب تھا۔اکبرالہ آبادی کا نظریہ یہ تھا کہ ہم دوسروں کا سہارا نہ لیں،دوسروں کے نقش قدم پر نہ چلیں۔خود ہی آزادی،ترقی اور خوشحالی کے لئے جستجو کریں۔جب کہ سرسید احمد خاں مغربی تہذیب،جدید تعلیم اور مغربیت کے حامی تھے۔سرسید کو قوم کی فلاح اسی میں نظر آرہی تھی کہ ہماری قوم جدید تعلیم حاصل کرے گی تو ہی انگریزوں اور ہندوؤں کے ہم پلہ ہوگی۔مختلف اشعار میں اکبرالہ آبادی نے سرسید احمد خاں کو نشانہ بنایا ہے۔

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رک نہیں سکتی
کسی سے مشرق و مغرب کی سازش رک نہیں سکتی
وہ نزلہ رک نہیں سکتا ، یہ پیچش رک نہیں سکتی
بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی

کہے کوئی شیخ سے یہ جاکر کہ دیکھئے آکے بزم سید
یہ رونق اور یہ چہل پہل ہوتو کیا برا ہے گناہ کرنا
تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب
گورنمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے

اکبرالہ آبادی نے علی گڑھ کالج کولندن کی مسجد کہا ہے، یہ ان کے فکر کی انتہا ہے لیکن جب علی گڑھ کالج کی اہمیت مسلمانوں میں بڑھنے لگی تو انھوں اس کی اہمیت کو بھی قبول کرلیا اور اس طرح کے اشعار قلم بند کئے۔ان اشعار میں بھی طنز غالب ہے۔

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگریوں کہ گویا آب زم زم میں داخل ہے
خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے ، امیر زادے شریف زادے
پڑھنے کا نہ ٹھیک اصول بڑھنے کی نہ راہ
اور قبلہ نہیں کوئی علی گڑھ کے سوا

اکبرالہ آبادی کی غزل گوئی اور طنز ومزاح نگاری کی طرح نظم گوئی بھی منفرد ہے۔انھوں نے ملت کے جذبات واحساس کو نظم کے پیرائے میں اس خوبی سے ڈھالا ہے کہ قاری خیالات کی شگفتگی اور افکار کی خوشبو سے جھوم اٹھتا ہے۔

صنم کے عشق میں پڑہی چکے تھے عقل پر پتھر
مسوں کے بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا
نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران ِ خود آرا

اکبرالہ آبادی کی نظموں میں مسلمانوں کے زوال کا ذکر بھی ہے اور اصلاح کی کوشش بھی، اخلاقی اقدار کا احیاء بھی ہے اور علم و ہنر کے حصول کی ترغیب بھی، مغربی تہذیب سے بیزاری بھی ہے اور اسلامی تشخیص کی برقراری بھی۔ان کی نظموں کی عمارت کے یہی ستون ہیں۔

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ
کون کہتا ہے نہ کر حسرت ِ لندن پیدا
کون کہتا ہے کہ قوم انگلش کا نہ ہو دل سے مطیع
کون کہتا ہے نہ کر الفت و لسن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی
یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول
راہ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

اکبرالہ آبادی نے اپنی نظموں میں ''صنعت الہزل الذی یراد بہ الجد'' (جدکا مطلب دانائی ہے) کا استعمال بڑی بے تکلفی سے کیا ہے۔اس صنعت میں کلام بظاہر ہزل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں نصیحت موجود ہوتی ہے۔مثلاً یہ شعر۔

تو بھی گریجوایٹ میں بھی گریجویٹ
علمی مباحثے ہوں میرے پاس آ کے لیٹ

یہ شعر بظاہر فحاشی (عریانی) کی عکاسی کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ مغربی تہذیب اور تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حیائی پر طنز ہے۔ اسی طرح کی چند مثالیں دیکھئے۔

دن تو جنات کی خدمت میں بسر ہوتا ہے
رات پریوں کی خوشامد میں گزر جاتی ہے

شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا
آپ بی اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پری زاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

مجموعی طور پر اکبرالہ آبادی کی ظریفانہ شاعری میں فکری اور موضوعاتی سطح پر خاصہ تنوع ملتا ہے۔ انھوں نے ظریفانہ نظم اور غزل دونوں میں اپنے عہد کی سیاست اور سماج میں پائی جانے والی ناہمواریوں کو لطیف طنز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے موضوعات نہ صرف علاقائی اور قومی سطح کے ہیں بلکہ عالمی سیاست اور عالمی سماجی منظرنامے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ عالمی سیاسی وسماجی منظرنامے کے بیان میں ان کی ظریفانہ شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اپنے منفرد اسلوب بیان، موضوعاتی تنوع اور فکری بالیدگی کی بناء پر اکبرالہ آبادی کا شمار ظریفانہ شاعری کے نمائندہ فن کاروں میں ہوتا ہے۔

وہ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصلح قوم بھی ہیں۔ ان کی شاعری ذہن کی کشادگی اور قلب کی تسکین کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ انھیں دل سے بھلا دینا ایک مشکل امر ہے۔ وہ ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہیں گے۔

اکبرالہ آبادی کی خطوط نگاری

اردو ادب میں خطوط نگاری ایک اہم اور دل چسپ صنف ہے جس نے نثر کو انفرادی اور ذاتی رنگ عطا کیا۔ ابتدا میں خطوط صرف اطلاع رسانی کا ذریعہ تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ ادبی اظہار کی صورت اختیار کر گئے۔ مرزا غالب کو اردو میں خط نویسی کا بانی مانا جاتا ہے، جنہوں نے خط کو محض رسمی انداز سے نکال کر اسے مکالماتی اور پرلطف بنا دیا۔ ان کے خطوط میں شگفتگی، ظرافت اور جذبات کی صداقت پائی جاتی ہے۔ میر مہدی مجروح کو لکھے اپنے خط میں غالب نے اپنی حالات زندگی کا شکوہ کچھ اس طریقے سے کیا ہے۔

''ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے؟ بے سبب ہوا غالب، دشمن آسمان اپنا۔ یار! زندگی تنگ ہوگئی ہے، موت کا خوف نہیں، مگر زندگی کے لوازم سے عاجز ہوں۔ ہر روز ایک نیا رنج، ہر دم ایک نئی مصیبت۔ آدمی اپنی عمر جیتا ہے یا دن کاٹتا ہے؟''(1)

غالب کے بعد سرسید احمد خان، حالی، شبلی اور دیگر مصلحین نے خطوط کے ذریعے علمی اور اصلاحی خیالات کو عام کیا۔ بعد ازاں اکبرالہ آبادی نے بھی اس روایت کو فروغ دیا۔ اکبرالہ آبادی کا نام اردو کے ان منفرد شعراء میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے طنز و مزاح کے ساتھ اصلاحی مقصد کو اپنا شعار بنایا۔ ان کا کلام ہی نہیں بلکہ ان کے خطوط بھی اردو نثر میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ اکبر کے خطوط ان کی شخصیت کے ہی نہیں بلکہ اس وقت کے سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں شگفتگی، برجستگی، حقیقت نگاری اور طنز و مزاح کے علاوہ قومی

اصلاح و بیداری کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ اکبر کے خطوط اردو ادب میں اس وجہ سے بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں کہ وہ محض ذاتی نوعیت کے نہیں بلکہ ادبی اور تہذیبی مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکبر کے خطوط صرف ادبی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ تاریخی دستاویز کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اکبر کے خطوط کی اہمیت ان جملوں میں بیان کرتے ہیں:

''اکبر نے خطوط کو محض شخصی اظہار تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انہیں اپنے عہد کے مسائل پر اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔''(2)

اکبر نے اپنے خطوط کے ذریعہ قوم کی اصلاحی و بیداری کا پیغام دیا۔ وہ معاشرتی خرابیوں، تعلیم کے مسائل اور مغربی تہذیب کے اثرات پر اپنے خیالات کا اظہار جا بجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی نثر کا انداز نہایت سادہ، رواں اور بامحاورہ ہے۔ وہ مشکل پسندی سے بچتے ہیں اور اپنی بات نہایت شگفتہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی اکبر کے خطوط کی خصوصیات کے متعلق لکھتے ہیں۔:

''اکبر کے خطوط میں ان کی شگفتہ طبیعت، برجستگی اور طنز کے رنگ نمایاں ہیں، انہوں نے خطوط کو محض پیام رسانی نہیں بلکہ تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔''(3)

مغربی تہذیب پر تنقید

انگریز مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب کے آگے کمتر سمجھتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ ہندوستانی بھی اپنی تہذیب کو مغربی تہذیب کے سامنے ہیچ جانے اور رفتہ رفتہ وہ تسلیم کرلے کہ ان کی ترقی اور کامیابی اسی میں ہے کہ وہ مغرب کی تقلید کرے۔ اکبر انگریزوں کی اس چال سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے

الماس احمد انصاری، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، لکھنو یونیورسٹی

اکبرقوم کے اندر پیدا ہو رہی معاشرتی خرابیوں اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر اپنے خطوط میں بھی طنز کرتے ہیں۔اکبر مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے مخالف تھے۔اپنے خطوط میں وہ مشرقی روایات،اخلاقی اقدار اور قدیم اصولوں کے تحفظ پر زور دیتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کو لکھے ایک خط میں اکبر نے ہندوستانی تہذیب و ادب کے زوال اور انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید کا شکوہ کیا ہے۔

''ہماری تہذیب کے دشمن وہی ہیں جو مغربی تقلیدی کو عین ترقی سمجھتے ہیں۔یہ نقالی ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گی۔''(4)

انہوں نے اپنے اس خط میں ایسے لوگوں کو قوم کا دشمن بتایا ہے جو بغیر سوچے سمجھے انگریزوں کی نقالی کرتے ہیں،ان کی اندھی تقلید میں لگے ہوئے ہیں اور مغربی تقلید کو اپنی ترقی سمجھتے ہیں۔

اکبر کے خطوط میں مزاحیہ عنصر

اکبر جس طرح اپنی مزاحیہ،شاعری کے ذریعے لوگوں کو ہنساتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پیغام بھی دیتے ہیں،اسی طرح سے وہ اپنی نثر میں بھی طنزیہ و مزاحیہ عناصر کو جگہ دیتے ہیں۔ان کے خطوط میں بھی ہمیں مزاح کے عنصر ملتے ہیں۔وہ اپنی بات اس طرح سے کہتے ہیں کہ قاری پہلے تو ہنسے گا لیکن بعد میں جب اس پر غور کرے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ انہوں نے اس مزاحیہ انداز میں ایک اہم پیغام دیا۔نواب محسن الملک کو لکھے خط میں اکبر نے خط کا جواب دیری سے دینے کا عذر مزاحیہ انداز میں کچھ اس طرح سے دیا ہے۔

''میں خط لکھنے میں اس لئے دیر کرتا ہوں کہ لوگ سمجھتے ہیں ہم مفت میں کام کرتے ہیں، حالانکہ مفت میں صرف دعا اور موت ملتی ہے۔''(5)

نیاز فتحپوری اکبر کی مزاحیہ نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اکبر کے خطوط میں ان کے مزاح کا عنصر بھی جھلکتا ہے، وہ اپنی بات اس انداز میں کہتے ہیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''(6)

اکبر کے خطوط کے موضوعات وسیع ہیں۔اکبر الہ آبادی کے خطوط میں سب سے نمایاں پہلو ان کے ذاتی حالات کی عکاسی ہے۔وہ اپنے روزمرہ معمولات،صحت،عالمی حالات اور دوستوں کے ساتھ تعلقات پر نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہیں۔اس میں ان کی شگفتہ مزاجی نمایاں رہتی ہے۔اکبر نے ایک خط میں اپنے دوست کو لکھا:

''بھائی، یہ دنیاں بھی عجب تماشا ہے،لوگ جیتے ہیں مرنے کے لئے اور مرتے ہیں جینے کے لئے۔''(7)

یہ پہلو اکبر کے خطوط کو صرف رسمی پیغام رسانی تک محدود نہیں رکھتا بلکہ ان کے شخصی مزاج اور زندگی کے تجربات کو بھی سامنے لاتا ہے۔اکبر نے اپنے خطوط میں اس دور کے سماجی اور تہذیبی مسائل کو بڑی سنجیدگی سے موضوع بنایا۔مغربی تہذیب کی اندھی تقلید،مشرقی اقدار کی زوال پذیری اور معاشرتی بگاڑ پر انہوں نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اظہار کیا۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

''اکبر کے خطوط میں مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر تنقیص اور مشرقی اقدار کی پاسداری کا جذبہ جا بجا نظر آتا ہے۔"(8)

عہد اکبر کے تعلیمی مسائل

اکبر کے خطوط میں تعلیمی،مسائل اور جدیدیت پر بھی گفتگو ملتی ہے۔وہ سرسید احمد خان کی تعلیماتی تحریک کے اثرات،انگریزی تعلیم کے فوائد اور اس کے

نقصانات پر تبصرہ کرتے ہیں۔اکبر ایسی تعلیم کے خلاف تھے جس کا مقصد صرف نوکری حاصل کرنا ہو۔اکبر کے مطابق تعلیم کا مقصد قوم کی سماجی اور تہذیبی تربیت ہے نہ کہ ان کو صرف کلرک بنانا۔مولانا شبلی نعمانی کو لکھے اپنے خط میں اکبر اپنے عہد کے تعلیمی نظام کو یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم نے دیکھا کہ مدرسہ کے طلبہ ڈگری کے طالب ہیں، علم کے نہیں۔ یہ حالت دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔"(9)

اکبر کے خطوط سے ہمیں اس عہد کے طلبہ کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے کہ طلبا علم حاصل کرنے کی بجائے سند حاصل کرنے کو ترجیح دے رہے تھے۔طلباء کے نزدیک تعلیم کے ذریعہ علم حاصل کرنا ان کا مقصد نہیں رہ گیا تھا بلکہ ڈگریاں حاصل کر کے کسی سرکاری دفتر میں ملازمت حاصل کرنا ان کی پہلی ترجیح ہوگئی تھی۔ عہد اکبر کے تعلیمی نظام کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اکبر نے خطوط میں تعلیم کے حوالے سے اپنی فکر کا اظہار کیا، جہاں وہ جدید تعلیم کے حق میں ہیں مگر اس کے ساتھ اخلاقی تربیت پر بھی زور دیتے ہیں۔''(10)

اکبر کے مذہبی افکار

اکبر کے خطوط میں مذہبی اقدار اور اخلاقیات کا ذکر بھی کثرت سے ملتا ہے۔وہ معاشرتی اصلاح کے لے مذہبی اصولوں کو اہم سمجھتے تھے۔اکبر الہ آبادی کی مذہبی فکر اصلاح اور اعتدال پر مبنی تھی۔ وہ دین کو محض رسومات تک محدود رکھنے کے خلاف تھے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو عقل وشعور کے ساتھ اپنانے کے قائل تھے۔ان کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید مسلمانوں کی دینی کمزوری کا باعث ہے۔اکبر نے مذہب کو معاشرتی اصلاح کا ذریعہ سمجھا اور علم و دین کے امتزاج پر زور دیا۔ وہ مادی ترقی کو بھی مفید سمجھتے تھے جب وہ دینی اقدار کے مطابق ہوں۔ان کے خطوط میں مذہبی بیداری، اخلاقی اصلاح اور اسلامی تہذیب کے تحفظ کا واضح پیغام ملتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو لکھے اپنے خط میں اکبر نے دنیوی تعلیم کو جسم اور دینی تعلیم کو روح سے تعبیر دی ہے۔

''دینی تعلیم کے بغیر دنیوی تعلیم ایسی ہے جیسے جسم بغیر روح کے، جو خوبصورت لیکن بے جان۔"(11)

اکبر کے ان جملوں سے دینی اور دنیاوی تعلیم کے باہمی رشتے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔اکبر کا یہ جملہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر کامیاب زندگی گزارنی ہے تو ہمیں دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم کو ایک جیسی اہمیت دینی ہوگی۔عہد حاضر میں بھی ہم صرف دینی تعلیم کے بھروسے یا پھر دنیاوی تعلیم کے بل پر آگے نہیں برھ سکتے۔اگر ہمیں متوازن زندگی بسر کرنی ہے تو اس کے لئے ہمیں دینی اور دنیوی دونوں طرح کے علوم کو ایک جیسی اہمیت دینی ہوگی۔ سید عبداللہ اکبر کی اس مذہبی فکر پر لکھتے ہیں:

''اکبر نے مذہب کو محض رسمی عبادت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا، ان کے خطوط اس بات کے شاہد ہیں۔''(12)

مختصر یہ کہ اکبر الہ آبادی کی خطوط نگاری ان کی شخصیت اور ان کیے عہد کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ان کے خطوط میں طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ اصلاحی پیغام اور قومی درد بھی نمایاں ہے۔یہی خصوصیات ان کے خطوط کو اردو ادب میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔آل احمد سرور اکبر کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اکبر کی خطوط نگاری اردو نثر میں ایک نئے ذوق کا اضافہ ہے، ان کے خطوط پڑھ کر قاری محظوظ بھی ہوتا ہے اور سوچنے پر مجبور بھی۔''(13)

حوالہ جات:

ا۔غالب کے خطوط۔مالک رام۔اردو اکیڈمی دہلی۔صفحہ:1

۲۔مقالات سید عبداللہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔مجلس ترقی ادب لاہور۔1960ء۔صفحہ۔203

۳۔گنج ہائے گراں مایہ۔رشید احمد صدیقی۔مکتبہ لمیٹیڈ دہلی۔1953۔صفحہ۔217

۴۔مکتوباتِ اکبر۔ظفر احمد صدیقی۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1951۔صفحہ۔15

۵۔اکبر کے خطوط۔سید مسعود حسن رضوی ادیب۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1953۔صفحہ۔67

۶۔نقوش اکبر۔سید مسعود حسن رضوی ادیب۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1954۔صفحہ۔61

۷۔گنج ہائے گراں مایہ، رشید احمد صدیقی۔مکتبہ لمیٹیڈ دہلی۔1953۔صفحہ۔220

۸۔اکبر الہ آبادی اور ان کا عہد۔سید مسعود حسن رضوی ادیب۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1955۔صفحہ۔78

۹۔انتخابِ خطوطِ اکبر۔سید مسعود حسن رضوی ادیب۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1957۔صفحہ۔102

۱۰۔تنقیدی مطالعے۔سید عبداللہ۔مجلس ترقی ادب لاہور۔1953۔صفحہ۔145

۱۱۔انتخابِ خطوطِ اکبر۔سید مسعود حسن رضوی ادیب۔انجمن ترقی اردو، دہلی۔1957۔صفحہ۔83

۱۲۔مقالاتِ،عبداللہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ۔مجلس ترقی ادب لاہور۔1960ء۔صفحہ۔205

۱۳۔مقالات سرور(تنقید اور اکبر)۔آل احمد سرور۔انجمن ترقی اردو، دہلی،1956۔صفحہ۔110

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعت کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں ردار لطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو ادباء کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہانہ ''خبر نامہ'' اور بچوں کا رسالہ ''باغیچہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اردو آئی۔ اے۔ ایس اسٹڈی سینٹر کا ''پارہ'' موہان روڈ لکھنؤ اور اکادمی کیمپس میں اردو میڈیا سنٹر کا قیام۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی اہم مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت	نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
۱۔	الہلال (تین جلدوں میں)	ابوالکلام آزاد	4200/-	۲۱۔	انتخاب قلی قطب شاہ	سیدہ جعفر	90/-
۲۔	ادب اور سماج	سید احتشام حسین	56/-	۲۲۔	غزل کا علامتی نظام	انیس اشفاق	122/-
۳۔	ابرا حسنی گنوری حیات اور ادبی کارنامہ	لیسین علی عثمانی	132/-	۲۳۔	مکاتیب مہدی افادی	مہدی بیگم	123/-
۴۔	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	محمود الحسن	147/-	۲۴۔	دیوان غالب جدید	مفتی محمد انوار الحق	135/-
۵۔	افکار و مسائل	سید احتشام حسین	76/-	۲۵۔	رامائن فراق حصہ اول	رائے سدھ ناتھ بلی فراق	104/-
۶۔	پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار	شمیم نکہت	94/-	۲۶۔	رامائن فراق حصہ دوم	رائے سدھ ناتھ بلی فراق	48/-
۷۔	پریم چند نئے تناظر میں	علی احمد فاطمی	80/-	۲۷۔	مراۃ الشعر	عبدالرحمان بجنوری	121/-
۸۔	تنقیدی جائزے	سید احتشام حسین	69/-	۲۸۔	فرہنگ شفق	لالتا پرساد شفق	283/-
۹۔	ذوق ادب اور شعور	سید احتشام حسین	76/-	۲۹۔	گنجینۂ تحقیق	سید احمد بجنور بدایونی	137/-
۱۰۔	عصمت چغتائی کی ناول نگاری	شبنم رضوی	85/-	۳۰۔	تحقیق کا فن	گیان چند جین	122/-
۱۱۔	عکس اور آئینے	سید احتشام حسین	67/-	۳۱۔	عکس گل	شمیم کرہانی	119/-
۱۲۔	مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	47/-	۳۲۔	انتخاب مراثی مرزا دبیر	اکبر حیدری کشمیری	217/-
۱۳۔	ندا فاضلی نمبر	پروفیسر علی احمد فاطمی	278/-	۳۳۔	انتخاب سجاد حیدر یلدرم	ثریا حسین	207/-
۱۴۔	انتخاب کلام فضا ابن فیضی	ڈاکٹر رفیق احمد	131/-	۳۴۔	انتخاب رشید احمدoeیقی	شہاب الدین ثاقب	85/-
۱۵۔	انتخاب خطوط غالب	اتر پردیش اردو اکادمی	28/-	۳۵۔	انتخاب مضامین سرسید	عتیق احمدoeیقی	74/-
۱۶۔	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری کا حصہ	ڈاکٹر درخشاں تاجور	603/-	۳۶۔	اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	175/-
۱۷۔	حالی کی اولین نثری تصنیف مولود شریف	آفتاب احمد آفاقی	131/-	۳۷۔	معصوم و فادار	ایچ۔ ایم۔ یلیسن	35/-
۱۸۔	کلیات شاد عارفی	پروفیسر مظفر حنفی	470/-	۳۸۔	فیروز اللغات جدید اردو	الحاج مولوی فیروز الدین	725/-
۱۹۔	ملک زادہ منظور احمد نمبر	انور جلال پوری	438/-	۳۹۔	انتخاب نثر (اول)	اتر پردیش اردو اکادمی	62/-
۲۰۔	کلیم عاجز نمبر	مناظر عاشق ہرگانوی	288/-	۴۰۔	انتخاب نثر (دوم)	اتر پردیش اردو اکادمی	78/-

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔ 010226 فون نمبر۔ 0532-4022924

E-mail : upurduakademi3@gmail.com

Naqsh-e-Nau

ISSN 2320-3781

Published by : Dept. of Urdu

Hamidia Girls' Degree College, Prayagraj

University of Allahabad